آسان درس قرآن
(سورۃ الکافرون تا معوذتین)
حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم
سابق صدر مفتی وحال شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین۔ ڈابھیل
ناشر: دار الحمد ریسرچ انسٹیٹیوٹ
سوداگرواڑہ، سورت، گجرات۔ (الہند)

ولقد یسّرنا القرآن للذکر

آسان درسِ قرآن (جزء:۲)

(سورۂ فلق، سورۂ ناس، سورۂ اخلاص، سورۂ لہب، سورۂ نصر، سورۂ کافرون)

از

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم العالیۃ

(بمقام: مسجد انوار، نشاط سوسائٹی، اڈاجن پاٹیا، سورت)

ناشر

دارالحمد ریسرچ انسٹیٹیوٹ

سوداگرواڑہ، سورت، گجرات۔ (الھند)

فہرست مضامین

باسمہٖ تعالیٰ

ابتدائیہ

آسان درسِ قرآن جزو دوم پریس کے حوالے ہونے کو ہے، تب دل جذباتِ شکر سے لبریز ہے، توفیق ہے اللہ رحمٰن ورحیم کی کہ نوبت بایں جا رسید۔ فالحمد للہ علی ذلک۔ رب کریم بعافیت اس سلسلہ کو جاری رکھ کر تکمیل تک پہنچائے۔ اور مرشدی ومحسنی حضرت الاستاذ دام مجدھم ومد ظلہم کو بصحت وقوت رکھے کہ درس کا یہ عمل پورے قرآن مجید کو محیط ہو جائے۔

الحمد للہ جزء اول کا پہلا ایڈیشن ختم ہونے کو ہے۔ قدردان حضرات سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ اسے خرید کر **دار الحمد** اور اس کے عملہ کی حوصلہ افزائی فرما کر آپ بھی اس کارِ خیر میں برابر کے شریک بنیں۔ الحمد للہ ہمارا مقصد تجارت نہیں ہے۔ اسی لیے کتاب کا ریٹ زیادہ نہیں رکھتے، بس ضروری خرچ نکل آئیں، اور کچھ برکت مزید ہو جائے تاکہ اداروں اور اربابِ فضل وکمال کے اعزاز واکرام کی کچھ صورت ہو جائے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ درس قرآن ہر مسجد میں کرنا ہے۔ اس کی مہم جامعہ ڈابھیل سے چلائی گئی ہے۔ حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی جولائی کے اواخر میں تشریف لائے تھے، سہ روزہ سیمینار رہا تھا، آخری دن کا موضوع یہی تھا۔ اس میں خود مہمانِ معظم نے اور سب سے اخیر میں میزبانِ محترم حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم نے میثاق و معاہدہ ہی لیا کہ ہر شخص اپنی جگہ جا کر درس قرآن کا کام شروع کرے گا۔ کوئی مسجد ایسی باقی نہ رہے، جس میں درس قرآن نہ ہوتا ہو۔ تاریخ کو دہرانا ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں دلی میں یہ منظر تھا کہ وہاں کی بیشتر مساجد میں درس قرآن ہوتا تھا۔ (حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم بحوالۂ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ)

تو یہ کتاب اس میں آپ کی معاون ثابت ہوگی۔ کچھ کرنا نہیں ہے۔ کرسی پر بیٹھ کر لوگوں کو چند صفحات پیشگی مطالعہ کر کے سنا دیں۔ ہر شخص سے دست بستہ مؤدبانہ یہ عرض ہے جو اِن سطور کو پڑھ رہا ہے کہ اپنے آپ کو اس مہم کا حصہ بنائیں۔ اور جامعہ ڈابھیل یا دار الحمد کو اس کی باقاعدہ اطلاع بھیجیں کہ کس گاؤں کی کس مسجد میں آپ نے یہ سلسلہ جاری فرمایا۔ جو حضرات پہلے سے درس قرآن عمومی دے رہے ہیں، وہ بھی مطلع فرمائیں کہ کب سے اور کہاں یہ کام کر رہے ہیں۔ اپنے حلقۂ احباب میں اس مشن کی خوب دعوت چلائیں۔ اور قرآن کریم سے امت کو براہِ راست مستفید ہونے کی راہ فراہم کریں کہ یہ ہماری ذمہ داری ہے، فرض منصبی ہے۔ اس کے بغیر ہم سبک دوش نہ ہوں گے۔

حضرت اقدس مرشدی طال بقاءهم بالعافية ہر ہفتہ پابندی اور اہتمام سے گذشتہ ہفتہ کا درس حرفاً حرفاً ملاحظہ فرماتے ہیں، اور اس میں ضروری اور مناسب اصلاحات سے نوازتے ہیں۔ اس کے بعد ہی مسودہ حرف آخر ہوتا ہے۔ فجزاهم الله خيرا.

عزیزم مولانا انور صاحب پارکھیتی، مولانا داود میمن اور مولانا عبدالاحد فلاحی سلمهم الله نے اس جزء کے لیے بھی اپنے اپنے حصہ کی خدمات فراہم کیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو اجر عظیم سے نوازے۔

آپ حضرات کے مشوروں، ہدایات و اصلاحات کا تاہنوز انتظار ہے۔ والانتظار أشد من الموت الأحمر۔ للہ کچھ تو بولیے!! کچھ تو لکھیے!! جو بھی لکھنا ہو آپ آزاد ہیں۔

پہلی قسط کی طباعت کے وقت، اس کے سب سے بڑے قدردان محبوبی و معظمی، مشفقی و محسنی حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً میری حوصلہ افزائی کے لیے موجود تھے۔ افسوس کہ آج حضرت نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ پر بے شمار رحمتیں نازل

فرمائے۔اور جو احسانات وشفقتیں مجھ پر فرمائیں،ان کا بھر پور جزاءِ خیر عطا فرمائے۔آمین

ہمارے دارالحمد کے مستقل معاونین کے لیے بھی سب ہی سے دعا کی درخواست ہے۔ یہ حضرات ہر ماہ پابندی سے اپنی متبرک للہ رقوم سے ہماری ہمت بڑھاتے ہیں۔

فجزاھم اللہ خیرا

اس درس کی خصوصیات پر تو ان شاء اللہ بعد میں اطمینان سے لکھوں گا۔ ابھی سرِ دست اتنا عرض کر دوں کہ:

❁ جس انسان نے اپنی زندگی نصف صدی سے زائد میدان تدریس میں مکمل کامیابی کے ساتھ پوری شان ووقار سے بتائی ہو۔

❁ جس کی احتیاط کا یہ عالم ہو کہ کوئی درس بھی بغیر تیاری کے نہ دیا ہو۔

❁ جس کا نظریہ ہو کہ بغیر تیاری کے سبق پڑھانا خیانت ہے۔

❁ جس کا تقویٰ وپارسائی ایک اجماعی مسئلہ بن چکا ہو۔

❁ جو شنبہ تا شنبہ آدھے گھنٹے کے درس کے مطالعے کے لیے ہوم ورک کرتا ہو۔

❁ جو اس درس کی کامیابی ومقبولیت عنداللہ کے لیے خود بڑے اہتمام سے دعا کرتا کراتا ہو۔

اس کے بیان میں جتنی خوبیاں جمع ہوں؛ کم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔ دارین میں اجر عظیم سے نوازے۔ اور پوری امت کو حقیقی قدر نصیب فرمائے۔ آمین۔

محمد طاہر سورتی

۱۲/ذی الحجہ ۱۴۳۹ھ

۲۳/اگست ۲۰۱۸ء

شبِ جمعہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ فلق

(مؤرخہ ۲۲؍جمادی الثانی ۱۴۳۹ھ مطابق: ۱۰؍مارچ ۲۰۱۸ء شب یک شنبہ)

(قسط-۱)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ من شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا وَ نَعُوذُ بِاللّٰہ من شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ أَنْ لَّا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ أَرْسَلَہٗ إِلیٰ کَافَّۃِ النَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَ دَاعِیًا إِلیٰ اللّٰہِ بِإِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَ عَلیٰ اٰلِہٖ وَ أَصْحَابِہٖ وَ بَارَکَ وَ سَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ.

فأعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم. بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم.

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲ وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝۳ وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۝۴ وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝۵ .

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم. قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱ مَلِكِ النَّاسِ ۝۲ اِلٰهِ النَّاسِ ۝۳ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ۵ الْخَنَّاسِ ۝۴ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝۵ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ۝۶ .

معوّذتین:

یہ قرآن پاک کی آخری دوسورتیں ہیں، سورۂ فلق اور سورۂ ناس۔ ان کو معوِّذتین بھی کہتے ہیں۔

معوِّذتین، واو کی تشدید اور واو کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے گا یعنی آدمی کو اللہ کی پناہ دلانے والی، ان کو پڑھے گا، تو اللہ تعالیٰ آدمی کو اپنی پناہ میں لے لیتے ہیں۔ معوَّذ، وہ جس کو پناہ دی جاتی ہے، تو عام طور پر اردو میں معوَّذتین بولتے ہیں اس طرح نہیں پڑھیں گے؛ بلکہ معوِّذتین، واو کے زیر کے ساتھ یہ صحیح قرار دیا گیا ہے۔

بینک میں جمع کرنے کی ضرورت نہیں:

یہ دوسورتیں ایک خاص نسبت سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے نازل فرمائیں۔ اس سے قبل ایک چیز بنیادی طور پر بتلا دوں کہ قرآن شریف میں کئی سورتیں اور کئی آیتیں ایسی ہیں جو کسی خاص واقعہ کے نتیجہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے نازل فرمائیں۔ مشرکین، یہود یا مسلمانوں کی طرف سے کوئی سوال کیا گیا، اور اُس سوال کے جواب کے طور پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایک آیت، چند آیتیں یا کوئی سورت نازل فرمائی۔

جیسے: (۱) حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ثعلبہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا (ابھی زکوٰۃ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا) کہ ہمارے کچھ غلام اور متعلقین ہیں، ہم ان پر کیا خرچ کریں؟ تو آیت نازل ہوئی: وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ۔(البقرۃ:۲۱۹) (اے نبی! یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کے راستہ میں کیا خرچ کریں؟ تو آپ جواب دے دیجیے کہ جو مال تمہارے پاس بچے وہ خرچ کردو) تمہاری ضرورت تم نے پوری کر لی، جو بچا، اس کو بینک میں جمع کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کو خرچ کر دو۔ زکوٰۃ سے پہلے یہ حکم نازل ہوا تھا۔(۱)

---

(۱) تفسیر ابن کثیر، سورۃ البقرۃ، آیت:۲۱۹

(۲) بخاری شریف میں روایت ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ ایک مرتبہ مدینہ منورہ کی بنجر زمین - خرابہ - سے گزر رہے تھے، میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھا، وہاں کچھ یہودی بیٹھے ہوئے تھے، آپ کا گزر اُن کے پاس سے ہوا، وہ نبیٔ کریم ﷺ کو دیکھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے کہ ان سے سوال کریں؟ یہودیوں کی عادت تھی، وہ شرارت کرتے رہتے تھے، نبیٔ کریم ﷺ کو چھیڑتے رہتے تھے، اور سوالات کرتے تھے، اور ان کا مقصد یہ ہوتا کہ ہم ایسا سوال کریں جس کا یہ جواب نہ دے سکیں؛ تاکہ ہمیں یہ کہنے کا موقع ملے کہ اگر یہ اللہ کے سچے نبی ہوتے، تو ہمارے سوال کا جواب دیتے۔

چناں چہ حضور ﷺ کو دیکھ کر ان کو شرارت سوجھی، ایک نے کہا: روح سے متعلق سوال کیجیے، پھر دوسرے نے کہا: بھئی! تمہیں تو معلوم ہے کہ یہ اللہ کے سچے نبی ہیں تم پوچھوگے تو وہ جواب دیں گے!!! کوئی ایسی بات نہیں کہیں گے جو تمہیں ناگوار ہو، کاہے کو پوچھتے ہو؟ تم جس مقصد کے لیے پوچھنا چاہتے ہو تمہارا وہ مقصد تو حاصل ہونے والا نہیں ہے، پھر بھی بعض نے کہا: نہیں! ہم ضرور پوچھیں گے، چناں چہ انہوں نے روح کے متعلق سوال کیا۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ: حضور ﷺ کے ہاتھ مبارک میں کھجور کی ایک ٹہنی تھی، جس سے ٹیک لگاتے ہوئے آپ چل رہے تھے، جیسے عصا سے ٹیک لگایا جاتا ہے۔ جب ان لوگوں نے سوال کیا تو آپ ﷺ کھڑے ہو گئے، اور اُن کو کوئی جواب نہیں دیا، میں سمجھ گیا کہ آپ ﷺ پر وحی کا نزول شروع ہو گیا، اور میں اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ وحی نازل ہوتے وقت نبیٔ کریم ﷺ کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ آپ کا چہرۂ انور سرخ ہو جاتا، اور سخت سردی میں بھی آپ کی پیشانی مبارک سے پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح لڑھکتے تھے، خراٹوں کی سی آواز آتی تھی، چناں چہ یہ کیفیت شروع ہوگئی۔ وہ کیفیت جب ختم ہوئی تو

اس کا مطلب یہ ہوا کہ وحی کے نزول کا سلسلہ ختم ہو گیا۔پس جب وحی نازل ہو گئی، تو حضور ﷺ نے آیت پڑھی: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا .(سورۃ الاسراء:۸۵)(۱)

مفسرین کی اصطلاح میں اس واقعہ (یہودیوں کے سوال کرنے) کو ان آیات کا شان نزول اور سبب نزول کہا جاتا ہے۔کیوں کہ یہودیوں کے سوال کے جواب کے طور پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

شانِ نزول:

کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی واقعہ پیش آیا اور اس سلسلہ میں لوگوں کو ہدایت اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی، تو اس پر آیتیں نازل ہوئیں، تو وہ واقعہ ان آیات کا شان نزول، سبب نزول ہوا۔یعنی ان آیات کے اترنے کا سبب یہ واقعہ بنا (لیکن وہ حکم، ہدایت اور وہ تعلیم قیامت تک کے لیے ہوگی، مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے) تو یہ شان نزول ایک خاص اصطلاحی لفظ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت یا اس سورت کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارے جانے کا سبب یہ ہوا۔تو جب بھی درس کے دوران یوں کہیں گے کہ اس کا شان نزول یا سبب نزول یہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس آیت یا سورت کو نازل فرمایا۔

بوقتِ ہجرت مدینہ منورہ میں آباد اقوام:

ان دونوں سورتوں کا بھی ایک شان نزول ہے۔مکہ میں یہودی نہیں تھے، وہاں

---

(۱) صحیح البخاري: ۱۲۵ و ۴۷۲۱ و ۷۲۹۷ و ۷۴۵۶ و ۷۴۶۲.

قریش ہی قریش تھے، عرب ہی عرب تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ آئے تو مدینہ منورہ میں دو قومیں آباد تھیں: (۱) عرب، جن کا مذہب بت پرستی تھا۔ اور ان کے دو قبیلے تھے: اوس اور خزرج۔ (۲) اور یہودی، یہ اہل کتاب بھی کہے جاتے تھے، یعنی وہ لوگ جن کو اللہ کی طرف سے پہلے آسمانی کتاب دی گئی ہو۔ چوں کہ یہودی حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام پر ایمان لاتے ہیں، اور حضرت موسیٰ پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے توریت نازل فرمائی، لہٰذا حضرت موسیٰ پر ایمان لانے والی اس قوم کو اہل کتاب کہا جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام پر اللہ تعالیٰ نے انجیل نازل فرمائی اور حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام پر ایمان لانے والے عیسائی کہلاتے ہیں، ان کو بھی اہل کتاب کہا جاتا ہے۔ چناں چہ وہ لوگ جن کو اللہ کی طرف سے ان کے نبی کے واسطہ سے کتاب دی گئی، وہ اہل کتاب کہے جاتے ہیں۔ جیسے ہمیں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطہ سے قرآن پاک عطا فرمایا۔ تو یہ دو قومیں یہود اور نصاریٰ، اہل کتاب کہلاتی ہیں۔

چناں چہ یہود مدینہ منورہ میں ان عربوں کے ساتھ آباد تھے، یہودی چوں کہ اہل کتاب ہیں، ان کے نبی پر اللہ کی طرف سے عطا کردہ کتاب ان کے پاس تھی۔ اور اس کے پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ تھا، مدرسے تھے، وہاں توریت پڑھائی جاتی تھی، اور پڑھانے والے بڑے بڑے علماء تھے، جیسے آج کل ہمارے مدارس اور ان میں پڑھنے والے طلبہ اور علماء ہیں، اس زمانے میں یہودیوں کے مدارس تھے۔ آج بھی ہیں۔

جب یہود میں زنا کا قصہ ہوا:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد یہودیوں میں ایک

قصہ ہوا کہ ایک مرد نے ایک عورت کے ساتھ زنا کیا۔ (یہود کے یہاں زنا کی سزا رجم یعنی سنگسار کرنا (پتھر مار کر ختم کر دینا) تھی۔ ہر زنا کی سزا، چاہے وہ زنا کرنے والے شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ اسلام میں زنا کرنے والے اگر غیر شادی شدہ اور آزاد ہیں تو ان کی سزا ۱۰۰ رکوڑے ہیں، غلام ہیں تو ۵۰ رکوڑے۔ اور شادی شدہ ہیں اور آزاد ہیں تو ان کی سزا رجم (یعنی پتھر مار کر ختم کر دینا ہے) بہر حال! یہودیوں کے سماج میں یہ زنا کا قصہ پیش آیا، تو ان یہودیوں نے سوچا کہ یہ نئے نبی آئے ہیں، ان کی شریعت بہت آسان ہے، اس میں بڑی سہولتیں ہیں، آج ہم اپنے آدمیوں کا فیصلہ ان کے پاس کرائیں۔

اس موقع پر علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں: ان کی بے وقوفی دیکھو! دین میں داخل ہوئے بغیر اس دین کی جو فیسیلیٹی ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ارے بھائی! پہلے ایمان تو لاؤ، مسلمان تو بنو، پھر اس دین کی سہولتوں سے فائدہ اٹھاؤ! مسلمان تو بنتے نہیں اور سہولتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو!

خیر! وہ آئے، اور انہوں نے نبیٔ کریم ﷺ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا کہ ان دو مرد اور عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہے، آپ ان کا فیصلہ کر دیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ جو فیصلہ کریں گے وہ بہت آسان ہوگا، سہولت والا ہوگا۔ تو حضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے یہاں اگر کوئی زنا کرے تو اس کی سزا کیا ہوتی ہے؟ تمہاری کتاب میں کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا: ہمارے یہاں تو کوئی زنا کرتا ہے تو اس کو سواری پر الٹا بٹھاتے ہیں، منہ کالا کرتے ہیں، اور اس کا ڈھنڈورا پٹوا دیتے ہیں۔ گویا ایک طرح کی اس کی فضیحت (ફજેતી) کروا دیا، یہ سزا ہوگئی۔ اُنہوں نے یہ کہا تو حضور ﷺ نے فرمایا: تمہاری کتاب توریت میں سنگساری اور رجم کا حکم نہیں ہے؟ تو انہوں نے کہا: نہیں ہے۔ ان کا عالم ابن صوریا تھا، وہ

وہاں کے مدرسہ میں بڑا مدرس تھا، وہ ساتھ آیا تھا، اس نے کہا: ہماری کتاب میں یہ نہیں ہے۔

بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے:

اس مجلس میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ جو پہلے یہودی تھے اور یہود کے بہت بڑے عالم تھے، توریت سے واقف تھے، موجود تھے۔ انہوں نے کہا: کیا توریت میں آیت رجم نہیں ہے؟ لاؤ! توریت لاؤ! فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (توریت لاؤ! اور اس کی تلاوت کرو، اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو) (آل عمران: ۹۳) تو وہ توریت لائے، اور **جو اُن کا عالم تھا، وہی پڑھتا تھا، اس نے آیت رجم پر اپنی ہتھیلی رکھ دی، اور اوپر نیچے کا پڑھنے لگا۔ تو حضرت عبداللہ بن سلامؓ جو ایمان لا چکے تھے، انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے ہٹایا کہ یہ پڑھو۔ چناں چہ ہاتھ کے نیچے آیت رجم نکلی، سنگساری کا حکم تھا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب رجم کا حکم ہے، تو کرو رجم !!!** وہ سوچ کر آئے تھے کہ کچھ آسان فیصلہ ہوگا، انہوں نے سوچا کہ کیا سوچ کر گئے تھے اور کیا ہو گیا! الٹا ہم اپنے یہاں رکھتے تو وہ اپنا کالے منہ والا فیصلہ ہو جاتا۔ حالاں کہ انہوں نے توریت کے حکم میں تحریف اور ردو بدل کر دیا تھا، اور کالا منہ کرنا ان کی شریعت کا حکم نہیں تھا۔ چناں چہ انہوں نے یوں سوچا کہ اگر ہم یہی ردو بدل والا کرتے تو فائدہ میں رہتے، یہ تو مار کھانی پڑی۔ چناں چہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ مسجد نبوی کے پڑوس میں جہاں جنازے پڑھے جاتے تھے وہاں ان دونوں کو رجم کیا گیا۔ [1] خیر! میں نے تو یہ قصہ اس لیے بیان کیا تھا کہ ان کے یہاں بھی مدرسے تھے، علماء تھے۔

---

(۱) صحیح البخاری: ۱۳۲۹ و ۳۶۳۵ و ۴۵۵۶ و ۶۸۱۹ و ۶۸۴۱ و ۷۳۳۲ و ۷۵۴۳.

یہود کو حضور کی رسالت کا یقین تھا:

حاصل یہ ہے کہ یہود نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کے دشمن تھے۔ حضور ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے، تو عرب میں اوس وخزرج ہی ایمان لائے تھے، اور آپ ﷺ نے ان یہودیوں کے ساتھ صلح کا معاملہ کیا کہ ہم آپس میں امن وامان کے ساتھ رہیں گے، آپس میں لڑیں گے نہیں، اور کسی کے دشمن کے مقابلہ میں اس دشمن کی مدد نہیں کریں گے۔ یہ طے ہوا تھا، یہودیوں نے صلح تو کی تھی؛ لیکن اندرونی طور پر وہ مسلمانوں کو اور نبی کریم ﷺ کو تکلیف پہنچانے کا کام کرتے رہتے تھے۔ اور اس سے قبل یہ بات گزر چکی کہ یہود بالیقین جانتے تھے کہ حضور اکرم ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں، جس نبی کو اللہ تعالیٰ نبیٔ آخر الزمان، خاتم النبیین بنا کر بھیجنے والے تھے وہ یہی ہیں، ان کی توریت میں باقاعدہ اس کی بشارت سنائی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نبیٔ آخر الزمان کو بھیجیں گے، ان کی یہ یہ نشانیاں ہوں گی، وہ ساری نشانیاں جو اپنی کتاب میں تھیں اس کے مطابق وہ لوگ دیکھ رہے تھے، اور اس کی وجہ سے ان کو اس بات کا یقین تھا۔

یعرفونہ کما یعرفون أبناءھم:

چناں چہ روایتوں میں آتا ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کا پہلا قیام قباء میں رہا، قباء میں آپ ﷺ ۱۴ یا ۲۴ روز تک ٹھہرے۔ (۱)

---

(۱) قال أنس رضي الله عنه: ...... فأقام النبي صلى الله عليه وآله وسلم فيهم أربع عشرة ليلة. (صحيح البخاري: ۴۲۸) قال العيني: و هذه رواية الأكثرين و كذا في رواية أبي داود عن شيخه مسدد و في رواية المستملي و الحموي "أربعا و عشرين ليلة" و عن الزهري "أقام فيهم بضع عشرة ليلة" و عن عويمر =

اسی زمانہ میں قبیلۂ بنونضیر کا ایک سردار حُی بن اخطب، جو ام المؤمنین حضرت صفیہؓ کا باپ تھا؛ عالم اور بڑے دبدبہ والا بھی تھا، تو وہ فوراً اپنے بھائی ابو یاسر بن اخطب کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے اور دیکھنے کے کے لیے کہ یہ وہی نبی ہیں قباء گیا اور رات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ گزاری۔ صبح جب گھر آیا تو اس کے بھائی کے ساتھ بات چیت ہوئی، تو بھائی نے پوچھا: یہ وہی ہیں؟ وہی یعنی آخری نبی جن کی حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام نے پیشین گوئی دی ہے؟ تو اس نے کہا: واللہ! یہ وہی ہیں۔ تو بھائی نے کہا: أتعرفه و تثبته (کیا تو اس کو جانتا اور اس کو تسلیم کرتا ہے؟) تو حی بن اخطب نے کہا: جی ہاں! پھر بھائی نے پوچھا: تیرے دل میں اس کے باب میں کیا بات ہے؟ تو حی بن اخطب نے کہا: بخدا! تادم حیات اس سے دشمنی رکھوں گا، پس وہ ایمان نہیں لایا۔ (۱) دیکھو! یہ گفتگو دو بھائیوں کے درمیان گھر میں ہوئی تھی، اس کو سننے والی حضرت صفیہؓ تھیں، انہوں نے بعد میں بتایا تھا۔ بہر حال! وہ یقین کے ساتھ جانتے تھے کہ اللہ کے سچے نبی ہیں، <u>قرآن میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: یعرفونه کما یعرفون ابناءھم۔</u> (سورۃ البقرۃ:۱۴۶) <u>(اے نبی! یہ لوگ آپ کی نبوت کو اور آپ کے نبی ہونے کو ایسا جانتے ہیں جیسا اپنی اولاد کو جانتے ہیں)</u>

= بن ساعدة "لبث فيهم ثماني عشرة ليلة ثم خرج" اهـ. (عمدة القاري: ۴/ ۲۵۹ ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

(۱) الروض الأُنف (۳۱۱/۴، ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت) و إحياء علوم الدين (۱۹۰/۳) (ط: دار المعرفة بيروت) قال العراقي: رواه ابن اسحاق في السيرة قال: حدثني عبدالله بن أبي بكر بن محمد بن عمرو بن حزم قال: حدثت صفية فذكره نحوه وهو منقطع أيضا (أي بين عبدالله بن أبي بكر و صفية رضي الله عنهم) (تخريج أحاديث إحياء علوم الدين: ۱۸۴۳/۴) (ط: دار العاصمة للنشر، الرياض)

ایک باپ اپنے بیٹے کا بیٹا ہونا یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ یہ یقینی طور پر میرا بیٹا ہے اسی طرح یہ لوگ بالیقین جانتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

اس سے بھی زیادہ:

بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے آیت کریمہ: یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ کے متعلق پوچھا کہ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نبی ہونا ایسا جانتے ہیں، جیسا اپنے بیٹوں کا بیٹا ہونا جانتے ہیں۔ تو حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: میں ان کو اپنی اولاد سے زیادہ جانتا ہوں، حضرت عمرؓ نے پوچھا: کیوں؟ تو انہوں نے کہا: ایک باپ اپنے بیٹے کا بیٹا ہونا اس لیے جانتا ہے کہ یہ میری بیوی کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے؛ لیکن ممکن ہے کہ اس کی بیوی نے خیانت کی ہو، اور کسی دوسرے سے تعلق قائم کیا ہو، اور اس کا نطفہ قرار پا گیا ہو، اور اس سے بیٹا پیدا ہوا ہو، یہ تو محض اپنا بیٹا ہونے کو جانتا ہے؛ اندر کی بات اس کو معلوم نہیں۔ **تو حضرت عبداللہ بن سلامؓ فرماتے ہیں کہ بیٹے کے بیٹا ہونے کے یقین میں تو گڑبڑ ہو سکتی ہے؛ لیکن ان کے اللہ کا رسول ہونے میں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔** حضرت عمرؓ نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا۔[1] تو یہودی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نبی ہونا بالیقین جانتے تھے۔

یہ ہم میں سے نہیں:

یہودی ایمان نہیں لائے۔ کیوں نہیں لائے؟ حسد کی وجہ سے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے توریت، انجیل، اگلی آسمانی کتابوں اور دوسرے صحیفوں میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

(۱) الكشاف للزمخشري و مفاتيح الغيب للرازي، سورة البقرة: ۱۴۶.

آنے کی خبر تو دی تھی، نشانیاں بھی بتلائی تھیں؛ لیکن یہ نہیں بتلایا تھا کہ وہ کون سے خاندان میں آئیں گے؟ آنے والے ہیں اور آئیں گے، یہ بات تم لوگوں کو بتاؤ، اور آئیں تو ان پر ایمان لانا، اللہ نے پہلے تمام نبیوں سے عہد لیا کہ اگر تمہاری زندگی میں وہ آخری نبی آئیں تو تم ان پر ایمان لاؤ گے۔ قرآن میں اس عہد کا تذکرہ ہے۔ لیکن یہ یہود سمجھتے رہے کہ آخری نبی ہمارے اندر ہی آئیں گے۔

اس سے قبل گزر چکا کہ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے: (۱) حضرت اسحٰق (۲) حضرت اسماعیلؑ۔ حضرت اسحٰق کے ایک بیٹے حضرت یعقوبؑ تھے۔ حضرت یعقوب ہی کا دوسرا نام اسرائیل تھا۔ اور انہیں کے بارہ بیٹے تھے۔ ان کی نسل میں جو لوگ پیدا ہوئے وہ سب یہودی کہلائے۔ تو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسحاقؑ کے بعد جتنے بھی نبی آئے وہ سب حضرت یعقوبؑ کی اولاد میں آئے، اور سب بنو اسرائیل کہلائے۔ حضرت عیسیٰ بھی بنو اسرائیل میں سے ہیں۔ لیکن آخری نبی کو اللہ نے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں بھیجا۔ وہ سب کے اوپر بھاری ہو گئے۔ چناں چہ یہودی یوں سمجھتے تھے کہ اب تک جیسے نبی بنو اسرائیل میں سے آئے تو آخری نبی بھی بنو اسرائیل ہی میں سے آئیں گے؛ لیکن انہوں نے جب دیکھا کہ بنو اسماعیل میں سے آئے، عربوں میں آئے، تو ان کو حسد ہو گیا کہ ہم میں کیوں نہیں آئے؟ **آج دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو یوں سمجھتے ہیں کہ خوبی، کمال ہمارے ہی اندر ہونا چاہیے، دوسروں میں وہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ یہی یہودیوں والی فطرت ہے۔** تو یہ یہودی اسی لیے ایمان نہیں لائے کہ یہ آخری نبی اسماعیل کی اولاد میں کیوں آئے؟ بنو اسرائیل میں کیوں نہیں آئے؟ بلکہ ان کو اس معاملہ میں اتنی شدت ہے کہ حضرت جبرئیلؑ سے بھی یہ لوگ دشمنی رکھتے ہیں کہ یہ وحی ان کے پاس لے کر کیوں آئے؟ حضرت

جبرئیلؑ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اپنی مرضی سے آئے تھے؟ اللہ کے حکم سے لائے؛ لیکن وہ یوں کہتے ہیں انہوں نے دوسرے کو بھیج دی۔ جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں۔

جانتے ہیں، مانتے نہیں:

حاصل یہ ہے کہ یہودیوں کو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بڑی دشمنی تھی۔ حالاں کہ شروع میں جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے، تو بہت سے احکام میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی موافقت کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی صریح حکم نازل نہ ہوا ہو، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہودیوں کی موافقت کو پسند کرتے تھے، تاکہ ان کی دل جوئی ہو، اور وہ اسلام کی طرف مائل ہوں؛ لیکن جتنی ان کی دل جوئی کی گئی وہ اتنے زیادہ اکڑتے گئے اور ان کی دشمنی اور زیادہ شدت اختیار کرتی گئی۔ یہاں تک کہ بعد میں حکم دیا گیا کہ ان کی مخالفت کرو۔

چناں چہ یہودی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اسی حسد کی وجہ سے کہ آپ بنو اسماعیل میں کیوں آئے؟ بنو اسرائیل میں کیوں نہیں آئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں لائے۔ حالاں کہ ان سب کو یقین تھا کہ یہ آخری نبی، جن کی بشارتیں، علامتیں، نشانیاں بتلائی گئیں وہ یہی ہیں۔ ساری نشانیاں دیکھ رہے ہیں، جان رہے ہیں پھر بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اسی حسد کی وجہ سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت ساری تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ ایسی تکلیفیں پہنچانا ان کا مزاج بن گیا تھا۔ قرآن میں اس کا تذکرہ موجود ہے: وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ. (آل عمران: ۱۸۶) (تم سے پہلے جن کو کتاب دی گئی وہ اور جو مشرک ہیں، ان سے تم

بہت تکلیف دینے والی باتیں سنو گے؛لیکن اس وقت تم صبر کرنا) قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے ۔تو یہ یہودی مختلف طریقوں سے تکلیف پہنچاتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سحر:

اسی سلسلہ میں یہ امر پیش آیا کہ ان لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کرایا۔ یہ واقعہ فتح الباری میں علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب حدیبیہ سے لوٹے، اس کے بعد محرم ۷ھ میں جادو کا واقعہ پیش آیا۔[۱] لبید بن اعصم نامی ایک شخص تھا، یہ اصل تو انصار کی ایک شاخ بنوزریق سے تعلق رکھتا تھا، لیکن یہ سب حلیف اور دوست تھے، ان کا یہودیوں کے ساتھ دوستانہ عہد اور ایگریمینٹ ہوا تھا۔تو یہ لبید بن اعصم یہودیوں کا حلیف تھا، اس نے خود اپنی بچیوں اور بیٹیوں کو جادو سکھلا کر خود بھی شریک ہوا اور بیٹیوں کے ذریعہ جادو کرایا۔[۲]

<u>جادو کرانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کنگھے سے سر اور داڑھی کو کنگھا کرتے تھے اس کنگھے کے کچھ دندانے، اور کنگھا کرنے کے بعد نکلنے والے کچھ بال استعمال کیے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک یہودی لڑکا آیا کرتا تھا، اس کو پھسلا کر اس کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بال مبارک اور کنگھے کے کچھ دندانے حاصل کیے، اور اس</u>

---

(۱) الطبقات الکبریٰ لابن سعد (۱۵۲/۲، ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت) و فتح الباري لابن حجر (۲۲۶/۱۰، دار المعرفۃ، بیروت)

(۲) قال ابن سعد: قال اسحاق بن عبد اللہ: فأخبرت عبد الرحمٰن بن کعب بن مالک بھذا الحدیث فقال: إنما سحرہ بنات أعصم أخوات لبید و کن أسحر من لبید و أخبث إلخ.... (الطبقات الکبریٰ: ۱۵۲/۲)

میں جادو کیا۔ اور کمان کی تانت پر گرہیں لگائیں۔ (۱)

اس لیے کہ جس پر سحر کیا جاتا ہے اس کے جسم کی کوئی چیز (ناخن، بال وغیرہ) ہونی چاہیے۔ یا کوئی ایسی چیز جو اس کے استعمال میں رہی ہو۔ اس کے بغیر جادو نہیں ہوتا۔

جادو میں کچھ ایسے کلمات پڑھے جاتے ہیں جن کے ذریعہ شیاطین کو خوش کیا جاتا ہے، ان کلمات کو سن کر وہ خوش ہوتے ہیں، اور ان کو جو کہا جائے وہ کرتے ہیں۔ یعنی جادوگر ان کلمات کو بول کر کے ان کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں۔ ہر سال وہ اس کی تجدید کرتے ہیں۔ سال میں ایک مرتبہ پڑھیں گے تو یہ کلمات سن کر وہ شیطان ایسا مطیع اور فرماں بردار بن جاتا ہے، کہ اس سے کہا جائے کہ اس کو نقصان پہنچاؤ، تو برابر اس کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ ہم تو ساری دنیا کے احسانات برداشت کر کے بھی اللہ کی اتنی فرماں برداری نہیں کرتے جتنا یہ شیطان اپنے خوشامدی کی کرتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اس تانت کے اوپر پڑھ پڑھ کر گیارہ گرہیں لگائی گئیں، پھر اس تانت میں وہ بال اور کنگھے کے دندانے رکھے گئے۔

اور بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور ﷺ کا موم کا ایک چھوٹا سا پتلا بنایا، اس میں چھوٹی چھوٹی گیارہ گرہیں لگائیں۔ (۲) بہر حال! جادو کا عمل تیار تھا، اس کو نر کھجور کے شگوفہ کے کَوَر میں بند کر کے بنو زریق کے ایک کنویں میں ایک بڑے پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس کنویں کا نام بئر ذی اروان تھا۔

---

(۱) بحر العلوم للسمرقندي (۳/ ۲۳۶-۲۳۷، ط: دار النشر: دار الفكر، بيروت) والكشف والبيان عن تفسير القرآن للثعلبي (۱۰/ ۳۳۸، ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت)

(۲) بحر العلوم للسمرقندي (۳/ ۲۳۷، ط: دار الفكر، بيروت)

جادو کا اثر، ذاتِ رسالت پر:

اس سحر کا اثر یہ ہوتا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی کام نہیں کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یوں سمجھتے تھے کہ وہ کام کیا ہے۔ چناں چہ بخاری شریف میں ہے: كان يرىٰ أنه يأتي النساء ولا يأتيهن. (۱) دراصل یہ جادو بیویوں کے ساتھ تعلق کے معاملہ میں کیا گیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیویوں کے ساتھ صحبت نہیں کی؛ لیکن اس جادو کے اثر کی وجہ سے یوں سمجھتے تھے کہ صحبت کی۔ بس! یہ تھا وہ اثر۔ چھ مہینے تک یہ اثر رہا۔ (۲) اور اس جادو کے نتیجہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے آپ کو ایسا محسوس کرتے تھے کہ میں بندھا ہوا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت تکلیف ہوتی تھی، اس جادو کا اور کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرضِ منصبی (آنے والے احکام اور وحی کو دوسرے بندوں تک پہنچانے) میں اس جادو کا کوئی اثر نہیں تھا۔

کوئی بڑے سے بڑا جادوگر بھی کسی نبی پر ایسا جادو نہیں کر سکتا، جس کے اثر سے وہ اپنے فرضِ منصبی اور اپنی ڈیوٹی کی ادائیگی میں کوتاہی کرے، یہ ناممکن ہے۔ تو اس جادو کی

---

(۱) صحيح البخاري: ۵۷۶۵.

(۲) أخرجه الإمام أحمد في مسنده برقم: ۲۳۸۲۶ (ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت) وقال الحافظ ابن حجر: وقع في رواية أبي ضمرة عند الإسماعيلي فأقام أربعين ليلة، وفي رواية وهيب عن هشام عند أحمد: ستة أشهر، ويمكن الجمع بأن تكون الستة أشهر من ابتداء تغير مزاجه والأربعين يوماً من استحكامه. (فتح الباري: ۲۰۶/۱۳، ط: دار طيبة، الرياض) وقال السهيلي لم أقف في شيء من الأحاديث المشهورة على قدر المدة التي مكث النبي صلى الله عليه وآله وسلم فيها في السحر حتى ظفرت به في جامع معمر عن الزهري أنه لبث ستة أشهر كذا قال وقد وجدناه موصولاً بالإسناد الصحيح فهو المعتمد. (الروض الأنف: ۲۰۰/۴-۲۰۱، ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت، ت: السلامي)

وجہ سے آپ ﷺ کی فیملی زندگی پر اثر ہوا۔ اور اس کی وجہ سے آپ ﷺ ایک گھٹن اور تکلیف محسوس کرتے تھے۔

جادو کا توڑ؛ دعا کی طاقت:

بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ میرے یہاں رات کو تشریف لائے، میری باری کا دن تھا؛ لیکن حضور ﷺ دعا میں مشغول رہے۔ دعا و دعا۔ اور مسلم شریف میں تین مرتبہ آیا ہے۔(۱) یعنی خوب دعا کی۔

اس تین مرتبہ لفظِ "دعا" پر حضرت شیخ زکریاؒ نے بڑی اچھی بات لکھی، فرماتے ہیں: سحر کے اثر کو دور کرنے کے لیے سب سے مؤثر چیز دعا ہے۔ رو رو کر اللہ سے مانگو، تو اللہ تعالیٰ اس کا راستہ نکالیں گے۔(۲)

پھر خواب میں دو آدمی آئے، وہ دو فرشتے تھے، ایک حضرت جبرئیلؑ، وہ سر کے پاس بیٹھے۔ اور دوسرے حضرت میکائیلؑ، پاؤں کے پاس بیٹھے۔ اب حضرت جبرئیلؑ حضرت میکائیلؑ سے پوچھ رہے ہیں کہ ان کو کیا ہو گیا؟ تو حضرت میکائیلؑ نے جواب دیا: ان پر جادو کیا گیا ہے۔ انہوں نے پوچھا: کس نے جادو کیا؟ تو جواب میں کہا: لبید بن اعصم نے۔ کس چیز میں جادو کیا؟ تو کہا: کنگھے اور اس سے نکلے ہوئے بالوں میں۔ وہ کہاں رکھا؟ تو کہا: نر کھجور کے شگوفے میں۔ اس کو کہاں دفن کیا؟ کہا: ذی اروان نامی کنویں میں پتھر کے نیچے۔ یہ سب حضور ﷺ کو خواب میں بتلایا گیا۔

---

(۱) صحیح مسلم: ۲۱۸۹.

(۲) الأبواب والتراجم: ۱۵۱/۲ (ط: دار البشائر الإسلامية، بيروت، لبنان)

اللہ نے حل بتلا دیا:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں جب حضور ﷺ بیدار ہوئے، تو مجھ سے کہا: عائشہ! میں نے اللہ تعالیٰ سے جو چیز پوچھی تھی، اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا حل بتلا دیا ہے۔ یعنی وہی دعا کی تھی کہ مجھے کیا تکلیف ہے؟ تو خواب میں بتلا دیا کہ یہ جادو ہے، جو آپ پر کیا گیا ہے۔ [(۱)]
حضور ﷺ اپنے مخصوص صحابہ حضرت علیؓ، حضرت عمارؓ، اور دو اور صحابی رضی اللہ عنہم تھے۔ [(۲)] ان کو لے کر گئے اور سب کچھ اندر سے نکالا اور ختم کیا۔ **اگر جادو کی ترتیب اور اس کا سیٹنگ ختم کر دیا جائے، تو جادو کا اثر بھی ختم ہو جاتا ہے۔** چناں چہ ترتیب ختم کر دی اور اس کو ایک جگہ دفن کر دیا۔

أحسن إلى من أساء إليك کی عملی تصویر:

حضور ﷺ نے دوسرے مسلمانوں کے سامنے بھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ نے لوگوں کو کیوں نہیں بتلایا؟ لوگوں کو بتلا دیتے کہ اس آدمی نے یہ حرکت کی ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مجھے اللہ نے شفا دے دی، اب میں نہیں چاہتا کہ کسی آدمی کے خلاف فتنہ بھڑکاؤں۔ [(۳)] وہ آدمی منافق تھا۔ اگر آپ ﷺ اظہار کر دیتے، تو صحابہ کو حضور ﷺ کے ساتھ جو محبت تھی

---

(۱) صحيح البخاري: ۵۷۶۴ و ۵۷۶۵.

(۲) جبیر بن إياس الزرقی و قیس بن محصن الزرقی (الطبقات الكبرىٰ لابن سعد ۲/ ۱۵۲ و ۱۵۳، ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

(۳) صحيح البخاري: ۵۷۶۴.

حضور ﷺ کے پسینے کے قطرے کی جگہ پر اپنے خون کو بہانے والے، وہ اس آدمی کے تو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے، لہٰذا حضور ﷺ نے کسی کو نہیں بتایا اور اخیر تک پتہ نہیں چلنے دیا۔ **اور وہ منافق آپ ﷺ کی مجلس میں آتا تھا، پھر بھی آپ ﷺ نے اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں فرمائی۔ یہ حضور ﷺ کے اخلاق ہیں، آپ ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ ایسا ہو تو اپنے دشمن کے ساتھ اس طرح معافی کا معاملہ کرو۔** تو آپ ﷺ نے ایسا معاف کیا کہ لوگوں کو بتایا بھی نہیں۔ اور آج کیا ہوتا ہے؟ حالاں کہ آپ ﷺ کو یہ جادو کس نے کیا؟ کس طرح کیا؟ یہ وحی کے ذریعہ بتایا گیا تھا۔ اس لیے کہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ حضرت جبرئیلؑ اور میکائیلؑ نے اللہ کے حکم سے آکر بتایا تھا تب بھی آپ نے کسی کو نہیں بتایا کہ کس نے جادو کیا ہے۔

عامل کا کہنا معتبر نہیں:

آج کس نے جادو کیا؟ کوئی بات یقینی نہیں ہے۔ اور آدمی دشمنی نکالنا شروع کر دیتا ہے۔ عامل لوگوں کو بھی چاہیے کہ کسی کو یہ نہ کہیں کہ فلاں نے کیا۔ آپ علاج کر لیجیے۔ لوگ بعض مرتبہ اس چکر میں پڑتے ہیں کہ بتاؤ کس نے کیا؟ کیوں کہ عامل جن چیزوں کے ذریعہ معلوم کرتے ہیں وہ کوئی وحی نہیں ہے۔ شریعت میں کسی کے خلاف ثبوت کے لیے یہ مسئلہ ہے کہ اولاً وہ آدمی خود اقرار کرے کہ میں نے یہ حرکت کی ہے، یا دو عینی گواہ جنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، اپنے کانوں سے سنا ہو وہ گواہی دیں، تو کسی چیز کا ثبوت ہو سکتا ہے۔ ان دو کے علاوہ کوئی تیسرا طریقہ کسی چیز کے ثبوت کا نہیں ہے۔ صرف عامل کہہ دے یہ معتبر نہیں۔

ایک سبق:

حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ میں نقل کیا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ نے القول الجمیل میں ایک جگہ چور کے معلوم کرنے کا عمل بتلایا ہے۔[1] تو اس کے نیچے لکھا ہے کہ یہ اس لیے نہیں ہے کہ آپ کسی پر الزام لگاؤ؛ بلکہ اس لیے ہے کہ اس کے ذریعہ آپ اندرونی طور پر تحقیق کر کے چپکے سے اس کو بتا سکتے ہو کہ دیکھو! یہ پتہ چلا ہے وہ مان لے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ قطعی اور یقینی طور پر اس پر الزام لگانا درست نہیں۔ کیوں کہ یہ

---

(۱) امداد الفتاویٰ ۴/ ۸۶ و ۸۸ و القول الجمیل (مخطوط عربی) ص: ۴۴

شاہ ولی اللہ صاحبؒ "القول الجمیل فی بیان سواء السبیل" میں فرماتے ہیں: چور کی پہچان کے لیے دو آدمیوں کو بدھنا تھما دیا جائے جسے وہ اپنے کلمے کی دونوں انگلیوں سے پکڑ لیں، مشکوک شخص کا نام کاغذ پر لکھ کر اسے بدھنے میں ڈال دے، "من المکرمین" تک سورۂ یٰسٓ پڑھے اگر وہی شخص چور ہوگا تو بدھنا گھوم جائے گا، اگر نہ گھومے تو دوسرے آدمی کا نام اس میں ڈال کر پھر یہی عمل دہرایا جائے، اسی طرح تمام مشکوک آدمیوں کا نام ڈالتا جائے اور "من المکرمین" تک پڑھتا جائے، چور کا نام سامنے آجائے گا۔ (القول الجمیل فی بیان سواء السبیل (مترجم) ص: ۹۹، ط: تصوف فاؤنڈیشن، لاہور) نیز حضرت فرماتے ہیں:

ویجب علی من اطلع علی السارق بامتثال ھذہ أن لا یجزم بسرقته ولا یشیع فاحشته بل یتبع القرائن فإنما ھي طریق اتباع القرائن. قال اللہ تعالیٰ: ولا تقف مالیس لک به علم. (القول الجمیل (مخطوط عربی) ص: ۴۴)

نوٹ: حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ (۴/ ۸۶ و ۸۸) میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے حوالے سے جو عمل نقل کیا ہے، وہ اُس عمل کے موافق نہیں ہے، جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنی کتاب القول الجمیل میں نقل کیا ہے۔ پس یہی کہا جائے گا کہ حضرت تھانویؒ نے یہ عمل شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کسی اور کتاب سے نقل کیا ہے، یا پھر نقل میں خطا ہے۔ المعصوم من عصمه اللہ. واللہ أعلم ۔۔۔

کوئی شرعی ثبوت نہیں ۔شرعی ثبوت دو ہی ہیں جس کا ذکر اوپر ہو چکا کہ وہ آدمی خود اقرار کرے یا دو نیک، صالح، عادل مسلمان گواہی دیں تب بات بن سکتی ہے۔

دیکھو! ہم لوگوں کے لیے اس میں بڑا سبق ہے۔حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ بتایا، اس کے باوجود آپ ﷺ نے اظہار نہیں کیا، بلکہ اس آدمی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، آپ ﷺ نے اس کا خاص خیال کیا۔اور ہم صرف گمانوں کی بنیاد پر کیا کیا کر ڈالتے ہیں!!!

بہر حال! یہ واقعہ پیش آیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریلؑ کے ساتھ یہ دو سورتیں نازل فرمائیں۔ان میں گیارہ آیتیں ہیں، سورۂ فلق میں پانچ ہیں اور سورۂ ناس میں چھ ہیں۔تو حضور ﷺ نے اس کو پڑھا، آپ ﷺ پڑھتے جاتے تھے اور تانت پر جو گیارہ گرہیں لگائی گئی تھیں، وہ کھلتی جاتی تھیں، اور جو موم کا پتلا بنایا گیا تھا اس میں جو سوئیاں چبھوئی گئی تھیں وہ بھی نکلتی جاتی تھیں۔

جب یہ عمل ہو گیا تو حضور ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بندھا ہوا تھا، اب کھل گیا ہوں۔اللہ تعالیٰ نے جادو کے لیے یہ عمل نازل فرمایا۔اگر علاج کے لیے آدمی یقین کے ساتھ اس کو انجام دے، تو اس سے ان شاء اللہ فائدہ ضرور ہوگا حضور ﷺ کے اس عمل میں ہم لوگوں کے لیے بڑا سبق ہے۔

جادو کا حکم:

اب جادو کا مسئلہ بھی جاننا چاہیے کہ جادو کا کیا حکم ہے؟ دیکھو! جن طریقوں سے جادو کیا جاتا ہے، اس میں آدمی کچھ کلمات پڑھتا ہے، کچھ بول بولتا ہے، جن کے ذریعہ ان شیاطین کو خوش کیا جاتا ہے، اور ان کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جس پر جادو کیا جائے اس کو تکلیف پہنچتی

ہے، اکثر وہ کفریہ کلمات ہوتے ہیں ۔یعنی اس جملہ کے زبان سے نکالنے کی وجہ سے آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے ۔ بسا اوقات کچھ اعمال کرواتے ہیں ،بعض مرتبہ تو باقاعدہ بچوں کو اغوا کر لیتے ہیں ،قتل کر دیتے ہیں ،بعض دیویوں پر ان کی بلی چڑھاتے ہیں ، اور اسی طرح قرآن کو نجاست میں ڈالتے ہیں ۔اس کے بغیر جادو سیکھ ہی نہیں سکتے ۔**الحاصل جادو میں ایسے کام یا ایسے کلمات کروائے اور کہلوائے جاتے ہیں کہ نتیجۃً آدمی ان کی وجہ سے ایمان سے نکل جاتا ہے۔سو یہ ایک خطرناک چیز ہے۔اگر ایسا کفریہ کام یا کلام نہیں ہے تب بھی وہ حرام ہے۔** اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: تم سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے اپنے آپ کو بچاؤ، اس میں ایک جادو کو بھی ذکر فرمایا ہے ۔ (۱) یہ اعلیٰ درجہ کا حرام ہے ۔اور اسلامی حکومت میں اگر سحر ثابت ہو جائے یا وہ اقرار کر لے، تو اس کے لیے بڑی سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

---

(۱) أخرجه البخاري برقم: ۲۸۵۷ ومسلم برقم: ۱۴۵ وغيرهما.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(مؤرخہ ۲۹/ جمادی الثانی ۱۴۳۹ھ مطابق: ۱۸/ مارچ ۲۰۱۹ء، شب یک شنبہ)

(قسط-۲)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوذُ بِاللّٰہ من شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا وَ نَعُوذُ باللّٰہ من شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ أَنْ لَّآ إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ أَرْسَلَہٗ إِلیٰ کَافَّۃِ النَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَ دَاعِیًا إِلیٰ اللّٰہِ بِإِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَ عَلیٰ اٰلِہٖ وَ أَصْحَابِہٖ وَ بَارَکَ وَ سَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا. أَمَّا بَعْدُ.

فأعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم. بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم.

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝۳ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۝۴ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝۵ .

یہ سورۂ فلق ہے، گزشتہ مجلس میں سورۂ فلق اور سورۂ ناس (معوّذتین) کا شان نزول تفصیل سے بتلایا تھا، اب اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی خاص صفت:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (آپ کہہ دیجیے کہ میں صبح کے مالک کی پناہ مانگتا ہوں)

فلق رات کے اندھیرے سے صبح کی نمودار ہونے والی روشنی کو کہتے ہیں، جس کو پو

پھٹنا کہتے ہیں۔رات بھر اندھیرا رہا، صبح اللہ تبارک وتعالیٰ روشنی پھیلا کر رات کے اندھیرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کردیتے ہیں۔ اور اپنی قدرت سے لوگوں کے قلوب میں امید پیدا کرتے ہیں کہ رات گئی، دن نمودار ہوا، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک خاص صفت ہے کہ وہ رات کے بعد دن کو لاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اسی صفت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اللہ کی پناہ حاصل کی گئی کہ میں صبح کے مالک کی پناہ چاہتا ہوں۔

اللہ ہی کی پناہ حاصل کیجیے:

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (ہر اس چیز کی برائی اور شر سے جو اس نے پیدا کی ہے)

اس دوسرے جملہ میں تمام مخلوقات کی برائی سے پناہ چاہی گئی ہے۔ چوں کہ سب کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی ان میں موجود برائیوں اور ان شرور سے بچا سکتے ہیں، اسی لیے اللہ کی پناہ حاصل کی جاتی ہے۔ جیسے کوئی آدمی کسی کی ملاقات کے لیے جائے اور گھر کے صحن میں خطرناک قسم کا کتا حفاظت کے لیے رکھا گیا ہے، جو ہر آنے والے پر حملہ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے، تو یہ جانے والا کیا کرے گا؟ اسی مالکِ مکان کو اطلاع کرے گا کہ بھئی! میں آپ کے یہاں آنا چاہتا ہوں؛ مگر آپ کے اس کتے کو قابو میں کیجیے، اس کی طرف سے تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے، اس سے میری حفاظت کا بندوبست کیجیے۔ یہ کام مالک ہی کرے گا۔

<u>اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی چیزیں پیدا کی ہیں، ان تمام کے شر سے اگر کوئی ہمیں بچا سکتا ہے، تو وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔</u> اس لیے اللہ ہی کی پناہ حاصل کرنی چاہیے۔ چناں چہ اس دوسری آیت میں جن چیزوں سے پناہ حاصل کی جاتی ہے اس میں ابتداءً ایک عام لفظ استعمال کیا

یعنی ہر اُس چیز کے شر سے جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی، اس میں تمام مخلوقات شامل ہوگئیں۔

مخلوقات میں عامۃً دونوں حیثیتیں ہوتی ہیں: خیر اور شر۔ اللہ تعالیٰ نے بعض مخلوقات کو چھوڑ کر دنیا کی تمام مخلوقات میں خیر اور شر دونوں کو رکھا ہے۔ فرشتے اور حضرات انبیاء معصوم ہیں۔ اور خیر کے حاصل کرنے اور شر سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ آدمی نیا لباس پہنتا ہے تو دعا کرتا ہے: اللّٰھم لک الحمد أنت کسوتنیہ إني أسئلک من خیرہٖ و خیر ما صُنع لہٗ و أعوذبک من شرہٖ و شر ما صنع لہٗ۔ [۱] یا سوار ہو، تو دعا پڑھتا ہے: اللّٰھم إني أسئلک من خیرھا و خیر ما جبلت علیہ۔ [۲] گویا اس خیر کا سوال کرتا ہوں جس کے لیے یہ پیدا کی گئی ہے، اور اس شر سے حفاظت چاہتا ہوں جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔ چناں چہ ہر چیز میں خیر و شر کا پہلو موجود ہے۔ لہٰذا مخلوقات کے شر سے پناہ چاہی گئی ہے اور پناہ دینے والی ذات اللہ ہی کی ہے۔ اس لیے پہلے ہمیں تمام مخلوقات کے شر سے پناہ چاہنے کا حکم دیا گیا۔

تین برائیوں سے پناہ:

اس کے بعد تین برائیاں ایسی ہیں، جن سے خصوصی طور پر پناہ چاہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

وَمِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (اور میں اندھیری رات کے شر سے پناہ چاہتا ہوں جب وہ پھیل جائے)

غاسق اندھیرے کو بھی کہتے ہیں اور اندھیری رات کو بھی۔ رات کا اندھیرا جب چھا

---

(۱) أخرجہ أبو داود في سننہ برقم: ۴۰۲۰، (ط: المکتبۃ العصریۃ، صیدا، بیروت) وغیرہ۔

(۲) أخرجہ ابن ماجہ فی سننہ برقم: ۱۹۱۸ (ط: دار احیاء الکتب العربیۃ، فیصل عیسی البابي الحلبي) و الحاکم فی المستدرک برقم: ۲۸۱۲ (ط: دار الحرمین للطباعۃ والنشر والتوزیع) و النسائی فی الکبریٰ برقم: ۱۰۰۲۱ (ط: مؤسسۃ الرسالۃ)

جاتا ہے، اور ہر چیز پر اس کا اثر آ جاتا ہے، اس کے بعد بہت سی چیزوں سے تکلیف پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: **جب سورج غروب ہوتا ہے، تو شیاطین اور جنات باہر نکل پڑتے ہیں، اسی لیے حدیث شریف میں اس وقت بچوں کو گھر میں رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔**[1] کیوں کہ یہ شیاطین اور جنات اس وقت ادھر ادھر منتقل ہوتے ہیں؛ یہ بچے کہیں ان کی زد میں نہ آجاویں۔ جب رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے، تو شیاطین، جنات، درندے، سانپ، بچھو اور حشرات الارض اپنے بلوں سے باہر آتے ہیں، لہٰذا ان کے شر سے بھی پناہ چاہی گئی ہے۔ اسی طریقہ سے چوری کرنے والے، لوگوں کو نقصان پہنچانے والے بھی اپنا کام رات کو ہی کرتے ہیں۔ ان کے شر سے بھی پناہ چاہی گئی۔ جادو کرنے والے بھی اپنا عمل عام طور پر رات کے اندھیرے میں کرتے ہیں، سو ان سے بھی پناہ چاہی گئی ہے۔ بہر حال! جتنی بھی نقصان پہنچانے والی چیزیں ہیں، ان کے اثرات زیادہ تر رات کے وقت ہوتے ہیں، اس لیے خاص طور پر رات کے شر سے پناہ چاہی گئی ہے۔

حسی اور معنوی اندھیرا:

اندھیرا ایک تو حسی ہوتا ہے اور ایک اندھیرا معنوی ہوتا ہے۔ جیسے: کفر و شرک کا اندھیرا، فسق و فجور کا اندھیرا، معاصی اور گناہوں کا اندھیرا، بد اخلاقیوں کا اندھیرا، گمراہیوں کا اندھیرا۔ قرآن کریم میں مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (البقرۃ: ۲۵۷) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہاں یہ حسی اندھیریاں مراد نہیں ہیں؛ بلکہ معنوی اندھیریاں مراد ہیں، کفر و شرک کی گمراہیاں مراد

---

(۱) أخرجه البخاري برقم: ۳۲۸۰ و مسلم برقم: ۲۰۱۲.

ہیں۔اور نور سے مراد ایمان کا نور ہے۔ چناں چہ معنوی اندھیریوں سے بھی پناہ چاہی گئی ہے ۔ یہ چیزیں بھی انسان کو شدید نقصان پہنچاتی ہیں۔ **ہم لوگ اس کا تذکرہ تو کرتے ہیں کہ آج کل ماحول بڑا خطرناک ہے، برائیاں پھیلی ہوئی ہیں، اندھیرا ہی اندھیرا ہے؛ لیکن اس سے پناہ چاہنے کے لیے جو تدبیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتائی گئی ہے، اس کا جس قدر اہتمام ہونا چاہیے وہ نہیں ہوتا۔ اس سورت کو پڑھتے وقت آدمی اس بات کا بھی تصور کرے۔**

روزِ اول سے انابت کا اہتمام ہو:

وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ (اور ان [شخصیتوں اور جانوں] کی برائی سے جو گرہوں پر پھونک مارتی ہیں)

نَفَث کا معنیٰ ہے کچھ پڑھ کر کے دم کرنا اس طور پر کہ تھوک کے کچھ ذرات بھی باہر نکلیں۔ جادو کے وقت جادوگر کی طرف سے جو کلمات پڑھے جاتے ہیں، اُن میں شیاطین وغیرہ سے مدد چاہی جاتی ہے، شرکیہ کلمات پڑھ کر تاگوں پر گرہیں لگا کر اس پر دم کرتے ہیں اسی کو نفَث کہتے ہیں۔ تو جادو کے لیے جادوگر عام طور پر یہی ترکیب اختیار کرتے ہیں، لہٰذا ان کے جادو کے شر سے پناہ چاہنا ہے۔

نفّٰثٰت کا ترجمہ بہت سوں نے تو عورتوں سے کیا ہے؛ لیکن صاحب روح المعانی اور اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ ایسا ترجمہ کیوں نہ کیا جائے جو ہر قسم کے جادوگروں کو (عورتیں ہوں یا مرد) شامل ہو۔ چناں چہ نفّٰثٰت کو نفوس کی صفت قرار دیا گیا، یعنی من شر النفوس النفّٰثٰت یعنی ان جانوں کے شر سے جو گرہوں پر جادو کرنے کے لیے پھونک مارتی ہیں۔ (۱)

---

(۱) روح المعانی ۱۵/ ۵۲۰ و ۵۲۱ (ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

تو جادوگر کے شر سے بھی پناہ چاہی گئی ہے۔جس آدمی پر جادو کیا جاتا ہے عموماً اس کو پتہ نہیں چلتا کہ وہ اپنے آپ کو بچانے کی تدبیر کر سکے۔ مدتوں تک تو آدمی پریشان رہتا ہے، آدمی بیماری سمجھتا ہے، مختلف علاج ومعالجے کرتا ہے، پھر بڑی مشکل سے اس کی تشخیص ہوتی ہے کہ یہ تو سحر ہے، پھر اس کے علاج کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔اور اللہ تعالیٰ تو سب کچھ جانتے ہیں، لہٰذا اگر پہلے ہی دن سے اللہ کی پناہ کا اہتمام کیا جائے، تو اللہ تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں، اور بچنے کی شکل پیدا فرماتے ہیں۔

گھٹن؛ حسد کا پہلا درجہ:

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے)

حسد کہتے ہیں کسی کی نعمت کو دیکھ کر دل کے اندر گھٹن پیدا ہونا۔اللہ تعالیٰ نے کسی کو دولت دی، اب آدمی دیکھتا ہے کہ اس کو دولت کیوں ملی؟ اس کی دولت کی وجہ سے اس کے دل میں تنگی اور گھٹن سی پیدا ہوتی ہے۔کسی کو اللہ تعالیٰ نے کوئی عہدہ عطا فرمایا، کسی کا کاروبار خوب چل رہا ہے، دوکان خوب چل رہی ہے، فیکٹری خوب چل رہی ہے، اس کو دیکھ کر اس کے دل میں گھٹن ہو رہی ہے کہ اس کے پاس یہ نعمت کہاں سے آ گئی؟ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی کو مقبولیت عطا فرماتے ہیں، اس کے کسی کام کی وجہ سے لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں، اور دیکھنے والوں میں بہت سے لوگوں کے دلوں میں گھٹن پیدا ہوتی ہے، اسی گھٹن کو حسد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یہ گھٹن حسد کا پہلا درجہ ہے۔

دوسرا درجہ اور اس کا علاج:

دوسرا درجہ یہ ہوتا ہے کہ اس گھٹن کے بعد وہ یہ تمنا کرتا ہے کہ یہ نعمت اس کے پاس

کیوں ہے؟ اس سے یہ نعمت چھن جانی چاہیے۔ان دو درجوں میں پہلا درجہ غیر اختیاری ہے۔آدمی کے اختیار کو اس میں دخل نہیں، آدمی کے نہ چاہتے ہوئے بھی، غیر اختیاری طور پر دل میں خیال آجاتا ہے؛لیکن **امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ آدمی کو چاہیے کہ اس کی طرف سے غافل نہ رہے؛ بلکہ اس خیال کو جمنے ہی نہ دے، اس سے پہلے ہی دل کو اس سے پاک و صاف کرنے کی کوشش کرے۔**(۱)

گھٹن کا علاج:

(۱)توبہ واستغفار:

چناں چہ اس پہلے مرحلے میں اللہ سے توبہ استغفار کرے، معافی چاہے کہ اے اللہ! میرے دل میں اس آدمی کی اس نعمت سے متعلق گھٹن کیوں آرہی ہے؟ تو یہ کیفیت ختم کر دے۔اور اللہ سے توبہ کرے۔یہ توبہ کا پہلا مرحلہ ہے۔

(۲)ترقی کی دعاء:

دوسرا مرحلہ یہ ہے اس آدمی کے لیے ترقی کی دعاء کرے۔یہ بڑا سخت مرحلہ ہے، بہت کڑوی گولی ہے۔لیکن بھائی! بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ جب تک کڑوی گولیاں استعمال نہ کرے، وہاں تک وہ ٹھیک نہیں ہوتی ہیں۔جیسے کسی کو لرزہ والا بخار (ملیریا) ہوگیا ہو تو کوینائن (Quinine) استعمال کرنی ہی پڑے گی، بغیر کوینائن کے وہ جانے والا نہیں ہے۔تو علاج کے اس دوسرے مرحلہ میں اس کے لیے دعا کرے کہ اے اللہ! اس کی اس

---

(۱)إحیاء علوم الدین للغزالي: ۳/۱۹۰-۱۹۲ (ط: دار المعرفة، بیروت)

نعمت میں برکت عطا فرما۔ اس کی وجہ سے دل کٹے گا، گویا دل پر آرہ چل رہا ہے، یہی اس کا علاج ہے، اس کے بغیر یہ چیز جانے والی نہیں ہے۔

(۳) لوگوں میں تعریف:

علاج کا تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کرے۔ اس کی خوبیوں کو بیان کرے۔ اس کے دل میں تو گھٹن ہورہی تھی، یہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اس کی تعریف کریں، جب اس سے اس کی مقبولیت نہیں دیکھی جاتی تھی تو بھلا اپنی زبان سے اس کی تعریف کرنا یہ کتنا مشکل کام ہے!!! اس سے بھی دل پر آرے چلیں گے۔ یہ دوسری کڑوی ٹیبلیٹ ہے۔ یہ تین چیزیں ہیں، ان تین چیزوں کا اہتمام کریں گے، تو دل کی کیفیت بدلے گی۔

گھٹن کو دل ہی دل میں رہنے نہ دیں، رہنے دیں گے تو یہ اندر جمے گی، اور ترقی کرے گی، پھر اس کا علاج مشکل ہوجائے گا۔ اور گھٹن کی کیفیت عام طور پر ہر ایک کے دل میں پیدا ہوتی ہے، بعضوں کو کبھی کبھی دل میں خیال آتا ہے؛ لیکن اس کو فوراً دور کرنے کے لیے اللہ کے حضور توبہ واستغفار اور جس کے لیے یہ کیفیت پیدا ہورہی ہے اس کے لیے ترقی کی دعا اور لوگوں کے اندر اس کی تعریف، یہ تین چیزیں کریں۔

دوسرا مرحلہ اس کی نعمت چھن جانے کی تمنا کا تھا۔ یہ بھی کبھی غیر اختیاری ہوتا ہے۔ اس کے متعلق بھی امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اس دوسرے مرحلے میں بھی آدمی کو مطمئن ہوکر نہیں بیٹھنا چاہیے؛ بلکہ اس کی طرف خاص توجہ کرکے علاج کی طرف دھیان دینا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بیماری اندر سرایت کرجائے۔ (۱)

---

(۱) إحیاء علوم الدین للغزالی: ۳/۱۹۱-۲۰۰.

یہ خطرناک ہے:

تیسرا مرحلہ اختیاری ہے۔ وہ یہ ہے کہ نعمت چھن جائے اب تک تو یہ خیال تھا، اب وہ نعمت اس کے ہاتھ سے نکالنے کے لیے آپ تدبیریں کر رہے ہیں۔ جہاں اس کو اونچا مقام ملا تھا، جس ادارے کی طرف سے ملا تھا، یا جس کے ماتحت یہ کام کرتا ہے، اس کے ذمہ دار کی طرف سے اس کو یہ مقام دیا گیا تھا، اس کے پاس جا کر اس کی جھوٹی شکایتیں کرنا، اس کے متعلق اس کو بدگمان کرنا؛ تاکہ وہ اس کے پاس سے یہ کام واپس لے لے۔ بہت سے یہی کرتے ہیں۔ چناں چہ یہ کوشش اختیاری ہے۔ یا اس کو بدنام کرنے کے لیے مستقلاً جھوٹی خبریں چلانا، اس کی غیبت کرنا، اس کے متعلق لوگوں میں بدگمانیاں پیدا کرنا، جھوٹا پروپیگنڈا کرنا، یہ اختیاری چیز ہے۔ یہ تیسرا درجہ خطرناک ہے، لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ یہ پیدا ہونے سے قبل ہی پہلے دو درجوں میں ہی اس کے علاج کی طرف خصوصی توجہ کرے، اور اس کا طریقہ وہی ہے جو ابھی گزرا کہ توبہ واستغفار ہو۔ اور جس کے متعلق یہ چیز دل میں پیدا ہوئی ہے اس کے لیے دعاؤں کا اہتمام ہو، اور لوگوں کے سامنے اس کی خوبیوں کا پوری بشاشت کے ساتھ تذکرہ کیا جائے۔ ورنہ یہ بیماری ایسی خطرناک ہے کہ آدمی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔

حسد ایک آگ:

لوگ جادو بھی اسی لیے کرواتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے خلاف کچھ کر نہیں سکتے، لہٰذا اس کو تکلیف پہنچانے کے لیے جادو والا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ کسی جادوگر سے رابطہ کرتے ہیں، باقاعدہ پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ یہ کوئی نیکی کے لیے پیسہ خرچ کرنا ہوا؟ اس کو

پیسہ دے کر اس آدمی کے خلاف جادوئی عمل کرواتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ تکلیف میں گرفتار رہوتا ہے۔

اور جادوئی عمل میں کبھی کفریہ باتیں یا کبھی کفریہ کام کرنے پڑتے ہیں، تو آدمی کفر تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ حسد ایسا خطرناک مرض ہے کہ اس کے نتیجہ میں آدمی ایمان تک سے محروم ہوجاتا ہے۔ اور اگر تیسرے درجہ کی وجہ سے یہ کام نہ کریں تو بھی دل میں جو گھٹن ہے وہ تو ایک ایسی آگ لگی ہوئی ہے، جو اندر ہی اندر اس کو جلانے کا کام کر رہی ہے۔ اس لیے اس کو دور کرنے لیے جو تدبیر بتائی گئی اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔ ورنہ یہ حسد کی آگ آدمی کو کھاجاتی ہے۔

حسد بڑا خطرناک مرض ہے، اس سے بہت ساری مصیبتیں پیدا ہوتی ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ خود آدمی اس کا علاج کرے، اس کی طرف توجہ کرے۔ یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ باری تعالیٰ نے اس کے لیے مستقل ایک آیت وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ نازل فرمائی ہے۔

حاسد مت بنیے:

دیکھو! آدمی کے دل میں غیر اختیاری خیال آیا، گھٹن پیدا ہوئی، پھر یہ خیال آیا کہ یہ نعمت اس سے چھن جائے، یہ غیر اختیاری ہے۔ یہ حاسد تو ہے؛ لیکن اس نے ابھی کوئی کارروائی شروع نہیں کی ہے۔ اور تیسرا درجہ جو بتایا، کارروائی شروع کی تو اب آپ پر تکلیف آئے گی۔ پہلے دو درجے تک محسود پر کوئی تکلیف نہیں ہے، حاسد خود ہی اپنی آگ میں جل رہا ہے؛ لیکن اگر یہ حسد یہاں ختم نہیں ہوا اور آگے بڑھا تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ محسود کے لیے

تکلیف میں مبتلا ہونے کی نوبت آئے گی۔ اور کون کس پر حسد کرتا ہے؟ پتہ چلتا نہیں ہے، اسی لیے اللہ کی پناہ حاصل کرے، وہ سب کے دلوں سے واقف ہے، وہی حسد کرنے والے کے شر سے بچا سکتے ہیں۔ اس لیے خاص طور پر اللہ کی پناہ حاصل کی گئی ہے۔ چناں چہ حسد سے اپنے آپ کو خاص طور سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

آسمان وزمین میں سب سے پہلا گناہ؛ حسد:

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ نے تفسیرِ عزیزی میں لکھا ہے کہ سب سے پہلا گناہ جو آسمان میں ہوا وہ بھی حسد، اور سب سے پہلا گناہ جو زمین میں ہوا وہ بھی حسد۔

آسمان میں: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کو پیدا کیا اور ان کو مقام عطا فرمایا تو شیطان نے آپ پر حسد کیا۔

زمین میں: حضرت آدم کے دو بیٹے ہابیل اور قابیل تھے۔ ہابیل کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا فرمائی وہ قابیل سے دیکھی نہیں گئی اور نتیجۃً اس نے اپنے بھائی کو قتل کرنے کی سازش کی اور قتل کیا۔ (۱) تو مطلب یہ ہے کہ یہ حسد آدمی کو کہاں تک پہنچاتا ہے؟ قتل تک کرواتا ہے۔ تو آدمی کو چاہیے کہ اس حسد کی بیماری سے اپنے آپ کو چھٹکارا دینے کے لیے بھرپور کوشش کرے۔

حسد، ایک حماقت:

حسد ایک حماقت ہی ہے۔ حسد کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ مال کیوں دیا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ عہدہ کیوں دیا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ عزت کیوں دی؟ اللہ تعالیٰ

---

(۱) تفسیرِ عزیزی پارۂ عم، ص: ۶۹۰، ط: کتب خانہ فیض ابرار، انکلیشور، گجرات۔

نے یہ مقبولیت کیوں دی؟ گویا اللہ تعالیٰ ایک نعمت اپنے بندے کو دے رہے ہیں، اس پر اس حاسد کو اعتراض ہے۔تو یہ اعتراض کس پر ہو رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ پر!!! اگر آپ اپنے ماتحتوں میں سے کسی کو کوئی چیز دیں، کوئی انعام دیں تو آپ کے ماتحتوں میں سے کوئی آپ پر اعتراض کرے کہ یہ آپ نے کیوں دیا؟ تو کیا آپ اس کو برداشت کر سکیں گے؟ نہیں۔ آپ اس کو سخت سے سخت سزا دیں گے۔ بھائی! تو کون بولنے والا؟ میری چیز تھی، میں نے اس کو دی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ.(الجمعة :۴) اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ. (النساء :۵۴) یہ حسد کرنے والے؛ اللہ نے جس کو اپنے فضل سے نعمت دی ہے، اس پر حسد کرتے ہیں؟ ان کو کڑھن ہوتی ہے؟ ان کے پیٹ میں درد ہوتا ہے؟ بھائی! اللہ نے اس کو اپنے فضل سے دیا، آپ کے پیٹ میں کیوں درد ہوتا ہے؟ آپ کیوں تکلیف میں پڑ رہے ہیں؟ **حاصل یہ ہے کہ یہ براہ راست اللہ تعالیٰ پر اعترض ہے، یہ بڑا خطرناک مرحلہ ہے، اس سے آدمی ایمان تک سے محروم ہو جاتا ہے۔** اس لیے یہاں اس سورت میں اس سے پناہ چاہی گئی ہے کہ حاسد جب حسد پر اترتا ہے، اور تکلیف پہنچانے کے لیے میدان میں آتا ہے، تو مسئلہ بڑا سنگین ہو جاتا ہے۔اس کے شر سے اللہ ہی حفاظت فرمائے۔ لہٰذا ہمیں خود بھی اپنے آپ کو حسد سے بچانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

دین کو مونڈنے والی:

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: إیاکم و الحسد فإنه یأکل الحسنات کما تأکل النار الحطب.[1] تم اپنے آپ کو حسد سے بچاؤ، اس لیے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح

---

(۱) أخرجه البخاري في تاريخه تعليقا: ۱/ ۲۷۲ (ط: دائرة المعارف العثمانية حيدرآباد، دكن) و أبو داود في سننه برقم: ۴۹۰۳ وغيرهما.

کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھاتی ہے۔ یعنی آگ سے لکڑی ختم ہو جاتی ہے تو حسد کی وجہ سے نیکیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے: قد دب إليكم داء الأمم قبلكم: الحسد و البغضاء. هى الحالقة، لا أقول: تحلق الشعر، ولكن تحلق الدين. إلخ أو كما قال صلى الله عليه وآله وسلم. (۱) **حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ: تم میں رفتہ رفتہ وہ دو چیزیں آرہی ہیں، جو اگلی امتوں میں تھیں: حسد اور دشمنی۔ یہ مونڈنے والی ہیں، میں نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈتی ہیں، بلکہ دین کو مونڈتی ہیں۔** جو آدمی اس میں مبتلا ہوتا ہے وہ غیبت کرے گا، تہمتیں لگائے گا، اس کو تکلیف پہنچانے کی تدبیریں کرے گا، یہاں تک کہ سب کچھ کر ڈالتا ہے۔ الحاصل یہ چیز آدمی کو دین سے محروم کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس لیے حسد سے اپنے آپ کو نہایت اہتمام کے ساتھ بچانے کی ضرورت ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو اس مرض سے بھی اور اس مرض میں جو گرفتار ہیں ان کی وجہ سے جو تکلیفیں پہنچ سکتی ہیں ان سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

---

(۱) أخرجه الترمذي فى جامعه برقم: ۲۵۱۰ (ط: مطبعة مصطفىٰ البابى الحلبى، مصر) وغيره.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۂ ناس

(مورخہ ۶/رجب المرجب ۱۴۳۹ھ مطابق: ۲۴/مارچ ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

(قسط-۱)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ من شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا وَ نَعُوذُ بِاللّٰهِ من شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ نَشْهدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ أَرْسَلَهٗ إِلٰى كَافَّةِ النَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَ دَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَ أَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ.

أعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم.

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ﴿۳﴾ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ﴿۴﴾ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ﴿۵﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿۶﴾

یہ معوذتین کی دوسری سورت ہے، پہلی سورۂ فلق تھی، اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور یہ دوسری سورۂ ناس ہے۔ دونوں کا شان نزول اور سبب نزول بتلایا جا چکا ہے۔ اب یہاں اس کا ترجمہ دیکھتے ہیں۔

دونوں سورتوں میں فرق:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (اے نبی! آپ کہیے کہ میں پناہ مانگتا ہوں سب لوگوں کے

پروردگار کی)

ان دونوں سورتوں میں بڑا فرق ہے۔

فرق یہ ہے کہ سورۂ فلق میں پناہ صرف اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ذکر کر کے اس کے واسطے سے مانگی گئی، اسی کی پناہ حاصل کی گئی۔ اور جن چیزوں سے پناہ مانگی گئی تھی وہ کل چار ہیں: (۱) تمام مخلوق جو اللہ نے پیدا کی۔ (۲) اندھیری رات کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے، پھیل جائے۔ (۳) گرہوں پر پھونک مارنے والی جانیں۔ (۴) حسد کرنے والے کے شر اور حسد سے، جب کہ وہ حسد کرنے پر آوے۔ جن سے پناہ مانگی گئی ہے وہ کل چار ہیں، اور جس کی پناہ حاصل کی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ایک ذات ہے۔ اس لیے کہ یہاں دنیوی مصائب سے پناہ چاہی گئی ہے۔ اور یہ مصائب صرف انسانوں کے ساتھ خاص نہیں ہیں؛ بلکہ دیگر مخلوقات کو بھی پیش آسکتی ہیں، اس لیے اللہ کی ایک صفت رب الفلق کو بیان کیا گیا۔

اور سورۂ ناس میں ہے کہ میں تمام لوگوں کے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔ انسانوں کا تذکرہ اس لیے کیا کہ اس میں جس مصیبت کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ دنیوی نہیں؛ بلکہ اخروی ہے، اور اس کا تعلق انسانوں سے ہے، دوسری مخلوقات کو یہ مصیبت پیش نہیں آتی، انسان اور جنات ہی کو پیش آتی ہے، اور انسان کو زیادہ پیش آتی ہے؛ اس لیے یہاں رب الناس کا تذکرہ کیا گیا کہ میں پناہ چاہتا ہوں تمام لوگوں کے پروردگار کی۔

مَلِكِ النَّاسِ (تمام لوگوں کے بادشاہ کی)

اِلٰهِ النَّاسِ (تمام لوگوں کے معبود کی پناہ چاہتا ہوں)

اخروی نقصان بڑا ہے:

یہاں اللہ کی تین صفات کا تذکرہ کیا گیا: (۱) صفت ربوبیت (۲) صفت ملوکیت

(۳) صفت الوہیت۔ گویا تین صفات کے واسطے سے اللہ کی پناہ حاصل کی گئی۔ اور جس چیز سے پناہ چاہی گئی ہے وہ ایک ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دوسری سورت میں معوّذ منہ- وسوسہ ڈالنے والا شیطان- کتنا خطرناک ہے!!! یہ اخروی مصیبت ہے، دین سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ اس وسوسہ کی وجہ سے خدانخواستہ ایمان برباد ہوگیا، تو آخرت خراب ہوجائے گی۔ سورۂ فلق میں جن چار چیزوں سے پناہ مانگی گئی تھی ان کا تعلق اور ان کا نقصان صرف دنیوی ہے۔ اور سورۂ ناس میں مذکور چیز کا تعلق آخرت سے ہے، اس لیے اس میں بڑا اہتمام کیا گیا، اور اللہ تعالیٰ کی تین صفات کے حوالے سے اللہ کی پناہ چاہی گئی۔

پروردگار جس کی پرورش کرتا ہے وہ اس کی حفاظت کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کا پروردگار ہے تو ان کی حفاظت کا بھی انتظام کریں گے۔ بادشاہ اپنی رعیت کی حفاظت کا اہتمام کرتا ہے، اور معبود اپنی عبادت کرنے والوں کی حفاظت کا اہتمام کرتا ہے۔ گویا یہاں تین تین طریقوں سے حفاظت کو مدنظر رکھا گیا، اور پھر جو پناہ چاہی گئی وہ ایک شر سے کہ مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ الۡخَنَّاسِ اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو پیچھے کو چھپ جاتا ہے۔

الوسواس عربی زبان کا مصدر ہے؛ یہاں اسم فاعل کے معنیٰ میں ہے، اور مصدر جب اسم فاعل کے معنیٰ میں لیا جائے، تو مبالغہ مقصود ہوتا ہے، یعنی بہت زیادہ وسوسہ ڈالنے والا۔ اور اتنا ہی نہیں کہ وسوسہ ڈالے؛ بلکہ خناس وسوسہ ڈال کر پیچھے کو چھپ جاتا ہے۔

خَنَسَ-یَخۡنِسُ کا معنیٰ پیچھے چھپ جانا ہے۔ لہٰذا اگر وہ جنات و شیاطین میں سے ہے، تو نظر نہیں آتا، پھر مزید برآں کہ وہ وسوسہ ڈال کر چھپ بھی جاتا ہے۔

وسوسہ کیسے ڈالتا ہے؟:

حدیث شریف میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **شیطان انسان کے قلب پر اپنی سونڈ رکھتا ہے۔ جب بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے، تو پیچھے چھپ جاتا ہے اور جب ذکر سے غافل ہوتا ہے، تو قلب میں وسوسے ڈالنے لگتا ہے۔**[۱] جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ مچھر کاٹنے کے لیے آتا ہے تو کیسا اپنی سونڈ رکھتا ہے۔ ایک بزرگ نے عالم مکاشفہ میں شیطان کو دیکھا تو اسی شکل میں دیکھا کہ وہ انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے؛ لیکن انسان جب اللہ کو یاد کرتا ہے، اللہ کا ذکر کرتا ہے، تو وہ فوراً پیچھے کھسک جاتا ہے۔ گویا بہت زیادہ پیچھے کو چھپنے والا اور بہت زیادہ وسوسہ ڈالنے والا۔ وسوسہ بھی ڈالتا ہے اور جوں ہی اللہ کا ذکر ہوتا ہے، ویسے ہی پیچھے چھپ بھی جاتا ہے۔

وسوسہ کیا ہے......؟

شیطان برائی کے وسوسے ڈالنے کے لیے دل کے راستہ سے اپنا اثر پیوست کرتا ہے، دل سے باتیں کرتا ہے۔ وسوسہ کیا ہے؟ شیطان کا انسان کے دل سے باتیں کرنا۔ ہمیں آواز تو سنائی دیتی ہے دل میں، وہ سامنے آتا ہے، لیکن نظر نہیں آتا۔ اسی طرح شیطان انسانی قلوب میں اپنا اثر پیوست کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (چاہے جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے)

---

(۱) أخرجه ابن أبی الدنيا في مكايد الشيطان: ۱/ ۱۹ (ط: المركز العربي للكتاب، الأمارات العربية المتحدة - الشارقة -) وأبو يعلىٰ الموصلى في مسنده: ۷/ ۲۷۸ (ط: دار المأمون للتراث، دمشق) وابن عدي فی الكامل: ۴/ ۱۲۹ (ط: دار الكتب العلمية بيروت، لبنان)

دونوں میں سے ہوسکتا ہے۔ شیاطین جن کی ایک قسم ہے ۔كَانَ مِنَ الْجِنِّ. (الکہف: ۵۰) باری تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں ۔ ابلیس سب شیطانوں کا باوا ہے، یہ بھی جنات کی قسم سے تھا۔

انسان بھی وسوسہ ڈالتے ہیں:

وسوسہ ڈالنے والے صرف شیاطین ہی نہیں؛ انسان بھی ہوتے ہیں ۔ شیاطین نظر نہیں آتے ، اور انسان نظر آتے ہیں، بات چیت کرتے ہیں۔ جو لوگ دوسروں کو برائی کی ترغیب دیتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں؟ دوسروں کے سامنے اُن غلط کاموں کی خوبیاں اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ وہ سن کر کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ یہی ہے وسوسہ اندازی۔

چناں چہ اس سورت میں وسوسہ ڈالنے والا چاہے جنات ہو یا انسان ، دونوں سے پناہ چاہی گئی ہے۔ چوں کہ اس کا نقصان آخرت سے متعلق ہے، اس لیے اس کا بڑا اہتمام کیا گیا۔ شیطان ہی انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ بہت سی مرتبہ تو اس کے وسوسہ ڈالنے کی وجہ سے لوگ ایمان سے محروم ہوجاتے ہیں، یا اس کی ایمان سے محرومی کی کوشش تو رہتی ہے؛ مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اور کبھی بجائے ایمان سے محرومی کے؛ گناہوں اور فسق و فجور کے وسوسے ڈالتا ہے، اور کبھی انہی وسوسوں کے نتیجہ میں آپس کے تعلقات خراب ہوتے ہیں۔ بھائی - بھائی میں لڑائی ہوتی ہے، میاں بیوی میں جھگڑا ہوتا ہے، اور اسی جھگڑے کے نتیجہ میں طلاق کی نوبت آتی ہے۔ یہ سب کون کراتا ہے؟ شیطان!

گھریلو جھگڑے ایک وظیفہ:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ شیطان پانی پر اپنا تخت بچھاتا ہے اور پھر اپنے چیلوں

چپاٹوں، چھوٹے چھوٹے شیاطین، شتونگڑوں سے رپورٹ لیتا ہے، وہ سب اس کے سامنے آ کر اپنے کارنامے بیان کرتے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ میں فلاں آدمی کے پیچھے رہا، وہ نماز پڑھنے کے لیے جارہا تھا، تو اس کو نماز پڑھنے نہیں جانے دیا، دوسرے کام میں لگا دیا۔ فلاں آدمی فلاں نیک کام کرنے جارہا تھا، میں نے اس کو وہاں سے ہٹا کر دوسرے کام میں مشغول کر دیا۔ اس طرح ہر ایک اپنا کارنامہ بیان کرتا ہے۔ وہ سب سے کہتا ہے: تم نے کچھ نہیں کیا اسی دوران ایک آ کر کہتا ہے کہ میں نے میاں بیوی میں لڑائی جھگڑا کرایا، یہاں تک کہ طلاق کی نوبت آ گئی۔ تو وہ اسے اپنے قریب کرتا ہے اور کہتا ہے: نِعم أنت (تو بڑا اچھا آدمی ہے) یہاں تک کہ اسے گلے لگا لیتا ہے۔[1] **چناں چہ جو طلاقیں واقع ہوتی ہیں، میاں بیوی کے جھگڑے ہوتے ہیں، ان میں بھی شیطان کی وسوسہ اندازی کا دخل ہوتا ہے۔ اور اس سے حفاظت کا طریقہ یہی ہے کہ ان سورتوں کو بکثرت پڑھنے کا معمول بنایا جائے۔** جہاں میاں بیوی کے جھگڑے بہت ہوتے ہوں اس کا بہت آسان وظیفہ ہے کہ اس سورت کو پڑھنے کا اہتمام کیا جائے۔ شیطان کی وسوسہ اندازی کی وجہ سے ہی ایسا ہوتا ہے۔

نماز کا وسوسہ:

آدمی کو جو وسوسے ڈالے جاتے ہیں ان کو علما نے لکھا ہے اور بعض روایتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے، جیسے نماز میں وسوسہ۔ بخاری شریف کی روایت ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں: جب اذان ہوتی ہے تو شیطان اذان کی آواز سن کر ہوا چھوڑتا ہوا بھاگتا ہے۔[2] اس لیے کہ

---

(۱) أخرجه مسلم برقم: ح ۲۸۱۳.

(۲) أخرجه البخاري برقم: ۲۰۸.

جو بھی اذان کی آواز سنے گا، اللہ تعالیٰ نے اس پر لازم کر دیا ہے کہ وہ گواہی دے، اور شیطان گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس لیے شیطان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کے کان میں اذان کی آواز نہ آئے۔ اس لیے وہ بھاگتا ہے، اور بھاگ کر ایسی جگہ چلا جاتا ہے، جہاں اذان کی آواز نہ آئے۔ پھر واپس آجاتا ہے۔ پھر جب نماز کے لیے اقامت کہی جاتی ہے، تو چوں کہ اقامت بھی أحد الأذانین (دو اذانوں میں سے ایک اذان) کہلاتی ہے، وہی کلمات اقامت کے بھی ہیں، پھر بھاگ جاتا ہے۔ پھر جب اقامت پوری اور نماز شروع ہوتی ہے تو وہ انسان کے دل پر آکر بیٹھ جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں کہ جو چیزیں اس کو نماز سے پہلے یاد نہیں تھیں، جن کی طرف اس کا دھیان بھی نہیں تھا، نماز کی نیت باندھی نہیں کہ یہ یاد کر، یہ یاد کر سب اس کو یاد دلاتا ہے۔ عجیب عجیب چیزیں اس کو یاد دلاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی قراءت بھی بھول جاتا ہے، اس کو غلطی ہوجاتی ہے۔ یہ نماز کا وسوسہ ہے۔[۱]

وضو کا وسوسہ:

وضو نماز کا مقدمہ ہے، وضو میں بھی وسوسہ ڈالتا ہے۔ وضو میں وسوسہ ڈالنے والا مستقل ایک الگ شیطان، جس کا نام ولھان ہے۔[۱] **بعض لوگ وضو میں بھی وسوسہ کا شکار ہوتے ہیں، وضو کرنے کے لیے بیٹھتے ہیں تو آدھا آدھا گھنٹے، ایک ایک گھنٹے تک ان کا وضو ہی ختم نہیں ہوتا، یہ شیطان کا اثر ہوتا ہے۔** ظاہر ہے کوئی آدمی کب تک اس کا مقابلہ کرے گا؟ کچھ مدت کے بعد آدمی مایوس ہو کر کہ بھئی! یہ ہمارے بس کا نہیں ہے، نماز ہی چھوڑ دے گا۔ اور اس کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ **اور ان وسوسوں کا علاج بھی یہی ہے کہ اس**

(۱) ورد هذا في الحديث الضعيف الذي خرّجه الترمذي في جامعه برقم: ۵۷.

کہ ان وسوسوں پر عمل نہ کیا جائے۔

اب تو بغیر وضو کے ہی نماز پڑھوں گا:

حضرت گنگوہیؒ کے متعلق لکھا ہے: حضرت فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ وضو کر کے اٹھا، تو خیال آیا کہ کہنی ذرا خشک رہ گئی ہے، تو گیا اور اس کو دھولیا۔ تاکہ شک دور ہو جائے۔ اس کے بعد نماز کی نیت باندھنا ہی چاہتا تھا کہ پھر خیال آیا کہ دوسری بھی خشک رہ گئی ہے، پھر جا کر اس کو دھویا۔ تاکہ یہ شبہ بھی باقی نہ رہے۔ پھر نماز کی نیت باندھنا ہی چاہتا تھا کہ خیال آیا کہ پاؤں کا ٹخنہ ذرا خشک رہ گیا ہے۔ جب یہ خیال آیا تو سوچا کہ یہ تو گرو گھنٹال ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ: میں نے کہا: اب تو میں بغیر وضو کے ہی نماز پڑھوں گا۔ پھر نہیں گیا۔ اس کا یہی ایک علاج ہے۔

موطا امام مالک میں ہے: حضرت سعید بن مسیبؒ- جو کبارِ تابعین میں سے ہیں ان- کے پاس ایک آدمی آیا، اور کہا: جب میں نماز کی نیت باندھتا ہوں، تو نماز میں یہ خیال آتا ہے کہ کچھ قطرہ نکلا، کچھ تری مجھے محسوس ہوتی ہے۔ تو حضرت سعید بن مسیبؒ نے کہا کہ وہ میری ران پر بہہ کر نیچے اترے گا، تب بھی نماز نہیں توڑوں گا۔ (۱) شیطان اس طرح نماز سے ہٹانا چاہتا ہے۔

وہم کا علاج:

بخاری شریف میں ہے: ایک آدمی کے متعلق حضور ﷺ سے عرض کیا گیا کہ وہ نماز

---

(۱) الموطأ للامام مالک: ۵۲ (ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت، لبنان)

کی نیت باندھتا ہے تو اس کو خیال آتا ہے کہ ہوا خارج ہوئی۔ اور اس کی وجہ سے وہ نماز توڑ کر وضو کے لیے جاتا ہے۔ اور اس کو بار بار یہ وہم ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ گیس کی وجہ سے ہوا مخرج تک آ کر واپس چلی جاتی ہے؛ لیکن آدمی کو یوں خیال آتا اور شبہ ہو جاتا ہے کہ شاید ہوا نکلی ہو اور وضو ٹوٹ گیا ہو۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: **جب تک آواز نہ سنے یا بو محسوس نہ کرے تب تک نماز نہ توڑے۔**(۱) اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ جس کو یہ مرض نہیں ہے، اس کو یقین ہے کہ ہوا نکلی، پھر وہ یوں کہے کہ میں نے آواز تو سنی نہیں۔ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جو وہم کا شکار ہو، اسی کو حضور ﷺ نے بیماری سے نکالنے کے لیے ایک تدبیر بتلائی۔ ورنہ اصل تو یہ ہے کہ **جب کسی کو وضو کے ٹوٹنے کا یقین ہو جائے تو چاہے بدبو محسوس ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، آواز سنی ہو یا نہ سنی ہو، وضو کرنا ہے۔**

آئندہ مجلس میں وساوس کے موضوع پر ان شاء اللہ، اللہ نے توفیق دی تو مستقلاً بات کریں گے۔ ابھی تو ترجمہ ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ کہیے کہ میں پناہ مانگتا ہوں سب لوگوں کے پروردگار کی۔

مَلِكِ النَّاسِ تمام لوگوں کے بادشاہ کی۔

اِلٰهِ النَّاسِ تمام لوگوں کے معبود کی۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۔ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ اس وسوسہ ڈالنے والے کی برائی اور شر سے جو پیچھے کو چھپ جاتا ہے۔ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ چاہے وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

بہر حال! معوذتین کے خاص خاص فضائل ہیں۔ اور خاص مقصد کے لیے نازل کی

---

(۱) أخرجه البخاري برقم: ۱۳۷.

گئی تھیں، اس لیے نبی کریم ﷺ نے بھی مختلف مواقع پر اس کے پڑھنے کی تاکید فرمائی اور ان کے فضائل بیان کیے ہیں۔

[١] پریشانی کے وقت معوّذتین کا ورد:

ابوداود شریف کی روایت ہے، حضرت عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں کہ میں **ایک مرتبہ سرورِ عالم ﷺ کے ہمراہ جحفہ اور ابواء کے درمیان تھا کہ اچانک آندھی آئی، اور سخت اندھیرا ہو گیا، حضور اکرم ﷺ سورۂ** قل اعوذ برب الفلق **اور** قل اعوذ برب الناس **کے ذریعہ اس مصیبت سے اللہ کی پناہ مانگنے لگے، یعنی ان کو پڑھنے لگے، اور فرمایا: اے عقبہ! ان سورتوں کے ذریعہ اللہ کی پناہ حاصل کرو! کیوں کہ ان جیسی اور کوئی چیز نہیں جس کے ذریعہ کوئی پناہ لینے والا پناہ حاصل کرے۔** اور پھر آپ نے ہمیں نماز پڑھائی اور یہی دونوں سورتیں نماز میں پڑھیں۔ (١)

دیکھو! بارش کے موسم میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خوب اندھیرا چھا جاتا ہے، بارش کی وجہ سے ایک طوفان کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے؛ لیکن ہمیں کبھی ان سورتوں کے پڑھنے کا خیال نہیں آتا۔ اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔

[٢] پریشانی کے وقت پڑھنے کا عمل:

حضرت معاذ بن عبد اللہ بن خبیبؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم ایسی رات میں جس میں بارش ہو رہی تھی اور سخت اندھیرا بھی تھا، حضور ﷺ کو تلاش کرنے کے لیے نکلے، چناں چہ ہم نے آپ ﷺ کو پا لیا، آپ ﷺ نے فرمایا: کہو۔ میں نے عرض کیا: کیا کہوں؟

---

(١) أخرجه أبو داود في سننه برقم: ١٤٦٣.

حضور ﷺ نے فرمایا: جب صبح اور شام ہو سورۂ قل ھو اللہ احد، سورۂ قل اعوذ برب الفلق اور سورۂ قل اعوذ برب الناس تین بار پڑھ لو۔ یہ عمل کر لوگے تو ہر ایسی چیز سے تمہاری حفاظت ہو جائے گی جس سے پناہ لی جاتی ہے۔ (یعنی ہر موذی سے اور ہر بلا سے محفوظ ہو جاؤگے) (۱)

کبھی معوذات، جمع کا صیغہ بھی بولا جاتا ہے تو اس میں سورۂ قل ھو اللہ بھی شامل کر لی جاتی ہے۔

[۳] فرض نمازوں کے بعد پڑھنے کا معمول

حضرت عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ ہر نماز کے بعد معوذات پڑھا کروں۔ (۲)

اس کی عادت بنالو تو بہت اچھی بات ہے۔

[۴] سفر میں، نماز فجر میں:

حضرت عقبہ بن عامرؓ نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ سفر میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے عقبہ! کیا میں تمہیں دو بہترین سورتیں نہ بتاؤں؟ پھر حضور ﷺ نے مجھے قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس دونوں سورتیں سکھائیں۔ آپ ﷺ کو اندازہ ہوا کہ مجھے زیادہ خوشی نہیں ہوئی، جب فجر کی نماز کے لیے اترے تو حضور ﷺ نے ان دونوں

---

(۱) أخرجه الترمذي في جامعه برقم: ۳۵۷۵ و أبو داود في سننه برقم: ۵۰۸۲.

(۲) أخرجه أحمد في المسند برقم: ۱۷۴۱۷ (ط: مؤسسة الرسالة) و أبو داود في سننه برقم: ۱۵۲۳ وغيرهما.

سورتوں کی نماز میں تلاوت فرمائی۔اور نماز سے فارغ ہوکر فرمایا: بولو عقبہ! تم نے کیسا دیکھا؟ (یہ فرما کر آپ نے ان دونوں کی فضیلت بتائی)(۱)

[۵] رات کا ایک عمل:

بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ روزانہ رات کو جب حضور ﷺ بستر پر تشریف لاتے تو سورۂ قل ھو اللہ احد، سورۂ قل اعوذ برب الفلق اور سورۂ قل اعوذ برب الناس پڑھ کر ہاتھ کی دونوں ہتھیلیوں کو ملا کر ان میں اس طرح پھونک مارتے تھے کہ کچھ تھوک بھی پھونک کے ساتھ نکل جاتا تھا۔ پھر دونوں ہتھیلیوں کو پورے بدن پر جہاں تک ممکن ہوتا تھا، پھیر لیتے تھے۔ یہ ہاتھ پھیرنا سر اور چہرے سے اور سامنے کے حصے سے شروع فرماتے تھے، اور یہ عمل تین بار کرتے۔(۲)

[۷] بیماری کا ایک عمل:

بخاری شریف میں ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کو جب کوئی تکلیف ہوتی تھی تو اپنے جسم پر سورۂ قل اعوذ برب الفلق اور سورۂ قل اعوذ برب الناس پڑھ کر دم کیا کرتے تھے، (جس کا طریقہ اوپر گزرا) پھر جس مرض میں آپ ﷺ کی وفات ہوئی اس میں، میں (حضرت عائشہؓ) یہ عمل کرتی تھی۔ (چوں کہ بیماری کی شدت کی وجہ سے حضور ﷺ بول نہیں سکتے تھے، پڑھ نہیں سکتے تھے) کہ میں دونوں سورتیں پڑھ کر آپ

---

(۱) أخرجه أبو داود في سننه برقم: ۱۴۶۲.

(۲) أخرجه البخاري برقم: ۵۰۱۷.

کے ہاتھ مبارک پر دم کر دیتی تھی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں کو آپ کے جسم پر پھیر دیتی تھی۔ آپ کے ہاتھوں سے برکت کے حصول کے لیے۔ (۱)

بہر حال! **یہ سورتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں، ان کو پڑھنے کی عادت ڈالو، صبح اور شام تو یقیناً پڑھا کرو، اور ہر نماز کے بعد اگر پڑھیں تو بہت اچھا ہے۔ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ ہر مصیبت سے حفاظت فرمائیں گے۔**

آج کل لوگ شکایت کرتے ہیں کہ فلاں نے یہ کر دیا، فلاں نے جادو کر دیا، کچھ کالا کر دیا۔ یہ سب اس لیے ہے کہ حفاظت کے جو طریقے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلائے ہیں، ان کا ہم اہتمام نہیں کرتے۔ ہمارے اسلاف کے یہاں ان سب چیزوں کا بڑا اہتمام تھا، وہ یہ سب کرتے تھے اس لیے وہ محفوظ بھی رہتے تھے۔ آج کل تو ساری چیزیں چھوٹ ہی گئی ہیں، ان کی طرف ہماری توجہ ہی نہیں ہے۔ اس لیے ان ساری چیزوں پر عمل کی عادت ڈالی جائے، اپنے بچوں کو بھی سکھلایا جائے، تاکہ بچپن سے ہی وہ اس کے عادی بن جائیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان شاء اللہ اس طرح کی مصیبتوں سے حفاظت فرمائیں گے۔

---

(۱) أخرجه البخاري برقم: ۵۰۱۶.

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ ناس

(مؤرخہ ۱۴/رجب المرجب ۱۴۳۹ھ مطابق ۳۱/مارچ ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

(قسط-۲)

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَ نَسۡتَعِیۡنُہٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُہٗ وَ نُؤۡمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَ نَعُوۡذُ بِاللّٰہِ من شُرُوۡرِ أَنۡفُسِنَا وَ مِنۡ سَیِّاٰتِ أَعۡمَالِنَا وَ نَعُوذُ بِاللّٰہِ من شُرُوۡرِ أَنۡفُسِنَا وَ مِنۡ سَیِّاٰتِ أَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشۡھَدُ أَنۡ لَّا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَ نَشۡھدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَ رَسُوۡلُہٗ أَرۡسَلَہٗ إِلیٰ کَافَّۃِ النَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا وَ دَاعِیًا إِلیٰ اللّٰہِ بِإِذۡنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیۡرًا صَلّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیۡہِ وَ عَلیٰ اٰلِہٖ وَ أَصۡحَابِہٖ وَ بَارَکَ وَ سَلَّمَ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا. أَمَّا بَعۡدُ.

أعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم. بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم.

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِکِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰہِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾ مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ الۡخَنَّاسِ ۪ۙ﴿۴﴾ الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ ٪﴿۶﴾

گزشتہ سے پیوستہ:

اگلی مجلس میں سورۂ ناس کا ترجمہ ہو چکا تھا، وضاحت بھی آئی تھی، آج پھر دوبارہ ترجمہ سن لیجیے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (کہیے کہ میں پناہ مانگتا ہوں سب لوگوں کے پروردگار کی) مَلِكِ النَّاسِ (تمام لوگوں کے بادشاہ کی) اِلٰهِ النَّاسِ (تمام لوگوں کے معبود کی)
مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ اس وسوسہ ڈالنے کے والے کی برائی اور شر سے جو پیچھے کو چھپ جاتا ہے۔ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ چاہے وہ جنات میں سے ہو، چاہے انسانوں میں سے۔

دین دار طبقہ کا سب سے بڑا پرابلم:

میں نے اگلی مجلس میں وعدہ کیا تھا کہ وساوس کے متعلق کچھ عرض کروں گا؛ کیوں کہ آج کل دین دار طبقہ کو سب سے بڑا پرابلم انھیں خیالات اور وساوس کا ہے۔ بہت سے لوگ ان کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں اور تکلیف کا شکار ہوتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں (بالخصوص حضرات صحابہؓ کے سوالات کے جواب میں) وہ آپ کے سامنے وضاحت اور تفصیل کے ساتھ پیش کی جائیں؛ تاکہ اس سلسلے میں آپ کو ایسی معلومات ہوں جو اطمینان کا ذریعہ بنیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ حضرات صحابہؓ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ انہوں نے بہت سی ہمیں پیش آنے والی باتیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا جواب دے کر اس کا حل بتلایا۔

روایاتِ وساوس:

وساوس کے سلسلے میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سارے ارشادات ہیں۔

ہمارے مدارس میں عربی کے چھٹے سال میں مشکوٰۃ شریف پڑھائی جاتی ہے،اس میں صاحب مشکوٰۃ نے مستقل ایک باب قائم کیا ہے باب في الوسوسة اس باب کے تحت بہت سی روایات صاحب مشکوٰۃ نے پیش کی ہیں۔ان سب کا پیش کرنا تو مشکل ہے،بقدر ضرورت کچھ باتیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

(۱)حضور اکرم ﷺ کا ایک ارشاد بخاری شریف اور دوسری احادیث کی کتابوں میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے منقول ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: إن الله تجاوزلي عن أمتي ما وسوست به صدورها، مالم تعمل أو تكلم. (اللہ تبارک وتعالیٰ نے میری امت سے معاف کردیا ان چیزوں کو جن کے ان کے دلوں میں وسوسے آتے ہیں جب تک کہ وہ ان پر عمل نہ کریں یا ان کو اپنی زبان سے ادا نہ کریں)[(۱)]

(۲)دوسری روایت مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے،فرماتے ہیں: إن ناسا من أصحاب رسول الله ﷺ سألوا النبي ﷺ إنا نجد في أنفسنا ما يتعاظم أحدنا أن يتكلم به. (حضور ﷺ کے صحابہ میں سے بعض نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ ہم اپنے دلوں میں کچھ ایسی باتیں پاتے ہیں جن کا اپنی زبان سے بولنا اور ظاہر کرنا ہمیں بہت بھاری اور گراں معلوم ہوتا ہے)[(۲)] تو نبی کریم ﷺ نے ان کا یہ سوال سن کر ان سے پوچھا: أو قد وجدتموه؟ کیا واقعۃً دل کی یہ کیفیت ہے؟ یعنی ان خیالات کی وجہ سے آپ کو ایسا ہوتا ہے اور ان کو ظاہر کرنا بہت گراں اور بھاری سمجھتے ہو؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: نعم۔جی ہاں!تو

---

(۱)أخرجه البخاري برقم: ۲۵۲۸

(۲)أخرجه مسلم برقم: ۱۳۲

نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا: ذالک صریح الإیمان (یہ تو کھلم کھلا ایمان ہے)۔

(۳) تیسری روایت مشکوٰۃ شریف میں حضرت ابن عباسؓ کی ہے: أن رجلاً سأل النبي ﷺ إني أحدث نفسي بالشیئ لأن أکون حممة أحب إلي من أن اتکلم به. (ایک آدمی نے نبیِ کریم ﷺ سے پوچھا: میں دل ہی دل میں باتیں کرتا ہوں، میں جل کر کوئلہ ہو جاؤں یہ مجھے زیادہ پسند ہے بنسبت اس کے کہ میں ان باتوں کو اپنی زبان سے بولوں) تو نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا: الحمد لله الذی رد أمرہٗ إلی الوسوسة. (تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے اس کا معاملہ وسوسہ تک محدود کر دیا)[۱]

ان ہی تین روایات کو سامنے رکھ کر آج آپ کے سامنے اس موضوع پر کچھ بات کرتا ہوں؛ تاکہ آج کل لوگوں کو خاص کر نوجوانوں کو رہبری ملے۔

شیطان بے وقوف تھوڑا ہے:

یاد رکھنا! وساوس دین دار طبقے اور ایمان والوں کو ہی پیش آتے ہیں۔ کافروں کو تو کاہے کو آئیں گے؟ اس لیے کہ شیطان ان وساوس کے ذریعہ سے ہی سامنے والے کو اپنا شکار بناتا ہے۔ کافر تو پہلے سے کافر ہی ہے، شیطان کو اس کو وسوسہ ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ اپنی محنت کیوں بے کار اور برباد کرے گا؟

ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ہمارے حضرت مفتی محمود حسن صاحبؒ جس زمانہ میں تدریس کی نسبت سے مظاہر علوم میں مقیم تھے۔ (یہ آزادی سے پہلے کی بات ہے) اس زمانے میں قادیانیت کا زور تھا، اور بہت سے لوگ قادیانی ہو رہے تھے، اس وقت ایک شیعہ آیا ہوا تھا

---

(۱) السنن لأبی داود: ۵۱۱۲ و مشکوٰۃ المصابیح: ۷۳.

اور وہ کئی روز مدرسہ کے مہمان خانہ میں ٹھہرا، اور مختلف مسائل پر مفتی صاحب سے اس نے باتیں کیں، سوالات و جوابات کیے۔ اس نے اپنے مذہب شیعیت کی حقانیت کو ظاہر کرنے کے لیے ایک بات یہ بھی کہی کہ جتنے بھی لوگ قادیانی بنتے ہیں، وہ سب سنی ہوتے ہیں۔ ایک بھی شیعہ آج تک قادیانی نہیں بنا۔ **حضرت نے جواب میں فرمایا کہ شیطان بے وقوف تھوڑا ہے؟ جو اپنی محنت ضائع کرے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ شیعہ تو پہلے سے ہی کافر ہے، تو اس پر محنت کر کے کاہے کو وقت ضائع کروں جس کے پاس ایمان ہو اس کو محروم کروں۔** بہر حال! حقیقت یہ ہے کہ یہ وسوسے ایمان والوں کو آتے ہیں اور ان میں بھی دین دار طبقہ ہی کو زیادہ آتے ہیں۔

وسوسہ کی اقسام:

(۱) ایمانیات سے متعلق:

ان وسوسوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ ہر ایک کا حل میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

(ان شاء اللہ)

(۱) وسوسہ کی پہلی قسم ایمانیات سے متعلق ہے۔ ہمیں ایمان لانے کا حکم دیا گیا، آپ بچپن سے پڑھتے ہیں: اٰمنت باللّٰہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاٰخر والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ والبعث بعد الموت. (ایمان لایا میں اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، قیامت کے دن پر، تقدیر پر بھلا ہو یا برا سب اللہ کی طرف سے ہے۔ اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے پر) یہ ایمان مفصل ہے، اس میں ان باتوں کو کو ذکر کیا گیا ہے۔ یہ احکامات قرآن میں بھی ہیں۔

اٰمنت باللّٰہ:

[۱] اللہ پر دو چیزوں کا ایمان لانا ہے، ایک تو اللہ کی ذات کو ماننا ہے۔ دنیا میں ایسے بہت سے لوگ ہیں، جو اللہ کو مانتے ہی نہیں، اللہ ہے ہی نہیں۔ نعوذ باللہ۔ ایسی باتیں کرتے ہیں۔ انکار کرنے والوں نے ہر ایک چیز کا انکار کیا، اللہ کے وجود کا بھی انکار کیا؛ البتہ موت ایک ایسی حقیقت ہے، جس کا آج تک کوئی انکار نہیں کر سکا ہے۔ باقی سب چیزوں کا انکار کرنے والے دنیا میں ہیں۔ چناں چہ ایک تو اللہ کے وجود کو مانیں، اور اس کی صفات پر بھی ایمان لائیں، اللہ کے ننانوے (۹۹) ناموں میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی جن صفات کو بیان کیا گیا ہے، ان پر ایمان لانا، اللہ تعالیٰ علیم، علم والا ہے، قدرت والا ہے، سننے والا ہے، دیکھنے والا ہے۔ الی آخرہ ...... اللہ اور اللہ کی تمام صفات کو مانو۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ جیسے: پیدا کرنا، پیدا اللہ ہی نے کیا، دنیا میں اللہ کے علاوہ کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے جو پیدا کرنا جانتا ہو، اسی طرح جو کچھ دینے والا ہے وہ بھی اللہ ہی دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ایمان لانا ہوا۔

وملٰئکتہ:

[۲] فرشتوں پر ایمان لانا، وہ ایک مخلوق ہے جو اللہ تعالیٰ نے نور سے پیدا کی ہے، جو نہ تو کبھی اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی کرتی ہے، اور اللہ تعالیٰ جو حکم دیتے ہیں، وہ اس کو پورا کرتی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ. (التحریم: ٦) (اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا اس کے ذرہ برابر بھی خلاف نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا اللہ نے ان کو حکم دیا ہے) اس کائنات کے نظام کو اللہ تعالیٰ چلاتے ہیں، اس نظام

کے چلانے میں یہ سارے فرشتے استعمال ہوتے ہیں۔فرشتے اللہ تعالیٰ کا اسٹاف ہیں۔اور بھی بہت سارے کام اللہ تعالیٰ ان سے لیتے ہیں۔

وکتبه:

[۳] اللہ تعالیٰ نے کتابیں بھیجیں۔توریت حضرت موسیٰؑ پر،زبور حضرت داودؑ پر، انجیل حضرت عیسیٰؑ پر،اور قرآن پاک ہمارے پیغمبر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل فرمایا۔

ورسله:

[۴] رسولوں پر ایمان لانا۔حضرت آدمؑ کے زمانے سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک مختلف ادوار میں موقع بموقع نبی آئے،جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے وحی لے کر آتے تھے،وہ اللہ کے بندوں تک اس وحی کو پہنچاتے تھے،اللہ کے بندوں کو وہ احکام سکھلاتے تھے۔تو رسولوں کی رسالت اور نبیوں کی نبوت پر ایمان لانا۔آخری نبی،نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے،اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت پر ایمان لانا۔

ان سب چیزوں پر ایمان لانا ہے،یہ ایمانیات کہلاتے ہیں۔یہ ایمان کی جڑ ہیں، ان کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے،ان کے بغیر کوئی آدمی مؤمن نہیں بن سکتا ہے۔اور خدانخواستہ اس میں ذرا بھی انیس بیس ہو گیا،تو آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے۔شیطان ان ایمانیات کے متعلق وسوسے ڈالتا ہے۔

بعض نوجوان آتے ہیں کہ مولانا! ہم کو خیالات آتے ہیں۔جب پوچھتے ہیں کہ بھائی! کیا خیالات آتے ہیں؟نہیں مولانا! میں نہیں بول سکتا۔ارے بھائی! بول تو سہی،تو

بولے تو ہم اس کا کوئی علاج کریں۔نہیں نہیں مولانا! میں بول ہی نہیں سکتا، میں انھیں زبان پر نہیں لاسکتا۔اس کو کتنا ہی سمجھاؤ؛ لیکن وہ بولے گا ہی نہیں۔ وہی صحابہؓ والی بات کہ یتعاظم أحدنا أن یتکلم به وہ خیال اتنا خطرناک ہے کہ ہم میں سے کوئی اس کو اپنی زبان پر لانا بہت گراں سمجھتا ہے۔

یہ کھلم کھلا ایمان ہے:

کبھی نعوذ باللہ! یہ خیال آتا ہے کہ اللہ میاں ہے بھی یا نہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی آئے بھی کہ نہیں آئے؟ بعضوں کے دل میں نبیوں کے متعلق ایسا وسوسہ آتا ہے۔ یہ ایمانیات کے متعلق وسوسے ہیں۔ جب کسی دیندار آدمی کو ایسا وسوسہ آتا ہے، تو وہ گھبراتا ہے، روتا ہے۔ اور یوں سمجھتا ہے کہ میں تو ایمان سے نکل گیا۔ اور اس کو جب پوچھا جائے تو کہے گا کہ میری تکلیف ایسی ہے کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ چناں چہ اس کے متعلق صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھ لیا، دوسرے نمبر پر جو حدیث بیان کی تھی إن ناسا من أصحاب رسول الله ﷺ سألوا النبی ﷺ إنا نجد فی أنفسنا ما یتعاظم أحدنا أن یتکلم به. (ہم اپنے دلوں میں کچھ ایسی باتیں پاتے ہیں جن کو اپنی زبان سے بولنا اور ظاہر کرنا ہم کو بہت بھاری اور گراں معلوم ہوتا ہے)[۱] یا وہ روایت أحدث نفسی بالشیئ لأن أکون حممةً أحب إلی من أن أتکلم به.[۲] (میں اپنے دل ہی دل میں کچھ باتیں کرتا ہوں، میں جل کر کوئلہ ہو جاؤں یہ مجھے زیادہ پسند ہے بنسبت اس کے کہ میں ان باتوں کو اپنی زبان سے بولوں) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

(۱) قد مرّ فی ص:۶۷.

(۲) قد مرّ فی ص:۶۷.

نے کیسا عجیب وغریب جواب دیا کہ ذاک صریح الإیمان. (یہ تو کھلم کھلا ایمان ہے) یعنی ایسا وسوسہ آنے پر تم کو جو تکلیف ہوئی اور تمہارا یہ احساس ہے کہ یہ زبان پر نہیں لا سکتے، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارے دل میں ایمان موجود ہے۔ اگر ایمان نہ ہوتا تو آپ اس کو زبان پر لانا بھاری نہ سمجھتے۔ اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایمان کی دلیل بتلایا۔

چور اُسی گھر میں جاتا ہے:

ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے یہی شکایت کی۔ تو حضرت نے فرمایا کہ دیکھو بھائی! چور اسی گھر میں جاتا ہے، جہاں مال ہوتا ہے۔ مال نہیں ہوگا وہاں چور کیوں قدم رکھے گا؟ یہ شیطان تمہارے پاس وسوسہ ڈالنے کے لیے آیا، تو معلوم ہوا کہ تمہارے دل میں ایمان ہے، تبھی تو اس ایمان سے ہٹانے کی وہ کوشش کررہا ہے۔ اسی کو گویا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ دو باتیں ہیں: ایک تو شیطان کا اس طرح آکر محنت کرنا اور دوسرا آپ لوگوں کا ان وسوسوں کو بھاری سمجھنا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارے دل میں ایمان موجود ہے۔ اگر ایمان نہ ہوتا تو یہ خیال نہ آتا۔ جیسے کافروں کو ایسے خیالات نہیں آتے، خیالات تو کیا، بلکہ وہ تو زبان سے ایسی باتیں بولتے ہیں مگر ان کو کچھ بھاری معلوم نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ ایمان ہے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ ایمان نکل گیا، یہ درست نہیں ہے؛ بلکہ یہ تو ایمان کی دلیل ہے۔ ہمارا عقیدہ اپنی جگہ پر ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ صرف اس طرح کے خیالات سے ایمان نہیں جاتا۔

آ بیل مجھے مار:

البتہ ایک بات کہوں گا کہ ایمان ایک بہت قیمتی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا

فرمائی۔ اور کسی بھی آدمی کے پاس جب کوئی قیمتی چیز ہوتی ہے تو اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کو میں ہر طرح بچاؤں، اس کی حفاظت کروں۔ ہمیں اپنے ایمان کی حفاظت بہت محنت سے کرنی ہے، بہت دھیان سے (તકેદારી સે) ایمان کی حفاظت کے لیے بہت چوکنا رہنا ہے۔ بہت سے لوگ غلط مضمون نگاروں (લેખક) کے مضامین پڑھتے ہیں۔ آج کل تو میڈیا پر مستقل ایسے پروگرام آتے ہیں اور لوگ ان پروگراموں کو دیکھتے ہیں سنتے ہیں، ارے بھائی! شیطان نے تو ہمارے ایمان پر حملہ کرنے کے لیے ہی یہ جاری کیا ہے اور ہم خود جا کر سنیں!!! گویا ہم اپنے ایمان کو خطرے کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ اس سے تو ہمیں اپنے ایمان کو بچانا ہے۔

ایمان سوز لٹریچر سے بچیے:

آج کل یہ ہو گیا ہے کہ جتنے بھی اخبارات ہیں، گجراتی اخبار: گجرات متر (ગુજરાત મિત્ર)، گجرات سماچار (ગુજરાત સમાચાર) سندیش (સંદેશ) ہیں۔ ان میں ایک دھارمک اضافیہ (ધાર્મિક પૂર્તિ) آتی ہے، تو اس کو A to Z پڑھ ڈالیں گے؛ لیکن ان کو کوئی دینی کتاب دیں گے، تو نہیں پڑھیں گے۔ إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ. ان کے پاس اللہ اور اس کے رسول کی باتوں کو پڑھنے کی فرصت نہیں ہے، اور پیسے خرید کر ان اخبارات کو لے کر پڑھتے ہیں۔ اور یہ دین کی کتابیں اللہ کے بندے چھپواتے ہیں اور مفت تقسیم ہوتی ہیں، لوگ لے بھی لیتے ہیں؛ لیکن ان کو پڑھنے کی فرصت نہیں۔ آپ میں اکثر وہ ہوں گے جن کے پاس ایسی مفت کی کتابیں آئی ہوں گی، جن کو آج تک کبھی کھول کر بھی

نہیں دیکھا۔ اور اخبار شوق سے دیکھیں گے۔ یہ سب کیا ہے؟ گویا ہم خود اپنے ایمان کو خطرے پر پیش کر رہے ہیں۔

امام محمد بن سیرینؒ کی احتیاط:

بڑے بڑے علماء، بڑے بڑے تابعین اپنے ایمان کی کیسی حفاظت کرتے تھے؟ حیرت ہوتی ہے۔ امام محمد بن سیرینؒ جو خواب کی تعبیر کے امام ہیں، بہت بڑے تابعی تھے، ان کے پاس ایک مرتبہ گمراہ فرقہ سے تعلق رکھنے والے دو آدمی آئے۔ -تابعین کے زمانہ میں ہی گمراہ فرقے پیدا ہو چکے تھے- انہوں نے آکر حضرت امام محمد بن سیرینؒ سے کہا کہ ہم آپ کو صرف ایک حدیث سنانا چاہتے ہیں، آپ نے انکار کیا، پھر انہوں نے کہا: ہمیں صرف قرآن کی ایک آیت سنانے دیجیے، بس! اس کے علاوہ ہم اپنی زبان سے کچھ نہیں بولیں گے۔ آیت سنا کر چلے جائیں گے۔ تو حضرت نے کہا: میں تمہاری زبان سے اس آیت کو سننا نہیں چاہتا، ان کے اصرار کرنے پر آپ نے فرمایا: یا تو تم یہاں سے چلے جاؤ یا پھر میں چلا جاتا ہوں۔ چناں چہ وہ دونوں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد کسی نے پوچھا کہ حضرت! وہ اگر چہ گمراہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے؛ لیکن انہوں نے تو ایک ہی بات کہی تھی کہ ہم آپ کو قرآن پاک کی صرف ایک ہی آیت سنانا چاہتے ہیں، تو قرآن کی آیت سننے میں کیا پرابلم تھا؟ تو اس پر حضرت نے کیا جواب دیا؟ ہم لوگوں کے لیے بڑی عبرت ہے۔ ہم تو ان کے علم کے مقابلہ میں انگوٹھا چھاپ (ان پڑھ) ہیں، ان کا علم اتنا عظیم تھا کہ ان کے سامنے ہماری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ پھر بھی <u>انہوں نے کیا جواب دیا؟ کہ ایک گمراہ عقیدے والے آدمی کی زبان سے قرآن پاک کی آیت سن کر ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید</u>

کی اس آیت کے سلسلہ میں میرے دل میں کوئی اعتراض پیدا ہو جائے۔[۱] اور ایسا اعتراض کہ بعد میں اس کا حل میری نگاہوں میں نہ ہو اور میں اس کی وجہ سے ایمان سے محروم ہو جاؤں۔ اس لیے میں اس کی زبان سے یہ آیت بھی سننا گوارہ نہیں کرتا۔

ایسا نہیں کرنا چاہیے:

زبان-زبان کا بھی فرق ہوتا ہے۔ چیز ایک ہی ہے؛ لیکن ایک کی زبان سے اس کا اثر اور ہے، دوسرے کی زبان سے اس کا اثر اور ہے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ انہوں نے کتنی احتیاط برتی؟ اب ان کی اس احتیاط کے مقابلہ میں ہمارا کیا حال ہے؟ ہمارا حال تو یہ ہے کہ کھاتے ہیں اگڑم بگڑم، تو پڑھتے بھی ہیں اگڑم بگڑم! جو آیا پڑھ لیا۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے؛ بلکہ پڑھنے کے معاملے میں بھی پہلے تحقیق کرلو۔ ایسا نہیں کہ جو آیا پڑھ لیا، اخبار میں جو مضمون آیا پڑھ لیا۔ آج تو میڈیا نے یہ طے کرلیا ہے کہ مسلمانوں کو ان کے عقائد کے سلسلے میں ایسے شک وشبہ میں ڈالا جائے کہ دھیرے دھیرے وہ اپنے ایمان سے محروم ہو جائیں۔

ایمان سے محرومی کا سبب:

آج میڈیا کی جانب سے جو باتیں پھیلائی جارہی ہیں وہ سب گمراہ کن ہیں۔ جیسے طلاق کے سلسلے میں میڈیا جو باتیں چلاتا ہے، ان کو بہت سے لوگ سنتے ہیں، ان کے پاس اپنا تو کوئی علم ہے نہیں، اب سننے کے بعد ان میڈیا والوں نے اس پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ دل میں بیٹھ جاتے ہیں، پھر آکر پوچھتا ہے کہ مولانا! ان سب سوالات کا کیا؟ ارے یہ

---

(۱) نقله الدارمي عن سعيد بن عامر عن اسماء بن عبيد (سنن الدارمي: ۱/ ۱۲۱، ط: دار الكتاب العربي، بيروت).

سب اعتراضات تو، تو نے اپنے دل میں بٹھا لیے! یہ چیز تو ایمان سے محرومی کا سبب ہے۔ کیا ضرورت تھی اس کو سننے کی؟ کبھی کسی عالم دین کے پاس، کسی ماہر کے پاس جا کر کوئی اچھی بات سننے کی توفیق تو ہوئی نہیں، اور یہ سب سن رہے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ یہ سب چیزیں ایمان کو ختم کرنے والی ہیں۔ ہمارا ایمان معمولی نہیں ہے، بہت قیمتی چیز ہے، اس کی حفاظت کا تقاضہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا میں جو پروگرام آتے ہیں، ان کو مت دیکھو، یا پرنٹ میڈیا میں جو مضامین آتے ہیں ان سے بچو، ان کو مت پڑھو۔ خبر پڑھ لی، ٹھیک ہے۔ مگر دین کی باتوں کو تو ہمیں اپنے معتبر علما سے سن کر اس کے مطابق یقین رکھنا ہے۔ آج تو کیا ہو گیا کہ ہر آدمی ہر آدمی کی بات سنتا ہے، پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شکوک وشبہات کا شکار ہو جاتا ہے، اور پھر دھیرے دھیرے دین سے ہٹ جاتا ہے۔ اس لیے اپنی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ ان سب چیزوں سے بچو۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غصہ:

مشکوٰۃ شریف میں ایک واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ توریت کا ایک نسخہ (copy) لے کر آئے۔ اب توریت تو آسمانی کتاب ہے؛ لیکن چوں کہ قرآن میں بھی آ گیا کہ ان لوگوں نے اس میں تحریف کر دی تھی، ادلا بدلی کر دی (Perversions) تھی۔ اس لیے اس کا بھروسہ نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو نسخہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لے کر آئے تھے وہ ایسا ہی تحریف والا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لا کر کہا کہ اللہ کے رسول! یہ توریت کا نسخہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش رہے، کچھ بولے نہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ تو اندر دیکھ کر پڑھ رہے ہیں اور ادھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ غصہ سے لال ہو رہا ہے۔

حضرت عمرؓ تو پڑھنے میں مشغول ہیں، ان کو پتہ نہیں ہے کہ حضور ﷺ غصہ میں ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ قریب ہی تھے، انہوں نے کہا: ثکلتک الثواکل یا ابن الخطاب! (اے ابن خطاب! رونے والی عورتیں تم کو روئیں) یعنی تم کو موت آوے۔ تم نہیں دیکھتے کہ حضور ﷺ کے چہرے کا کیا حال ہے؟ جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ بات کہی تو حضرت عمرؓ نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو حضور ﷺ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ فوراً اس کو بند کیا اور کہا: أعوذ باللہ من غضب اللہ و من غضب رسولہ رضینا باللہ رباً و بالإسلام دیناً و بمحمد ﷺ نبیاً۔ (میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کے غضب سے اور اس کے رسول کے غضب سے، میں اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور نبیٔ کریم ﷺ کے اللہ کا نبی ہونے پر دل سے راضی ہوں) پھر حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے اگر آج حضرت موسیٰؑ آ جائیں، اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرو تب بھی تم گمراہ سمجھے جاؤ گے، اور اگر میرے دورِ نبوت میں حضرت موسیٰ زندہ ہوتے، تو ان کو میری ہی پیروی کرنی پڑتی۔ [1] آپ ﷺ نے یہ بات اس لیے فرمائی کہ توریت تو آسمانی کتاب تھی؛ لیکن اس میں بھی تحریف ہو چکی تھی۔ اب آج کل کے رائٹر کی کتابوں کا کیا مطلب ہے؟

اس لیے دیکھو! جس کا علم گہرا ہو، جس نے دین کو سمجھ کر پڑھا ہو، دین کے سارے دلائل اس کے پاس موجود ہوں، وہ اگر ایسی کوئی چیز پڑھتا ہے تو پڑھے! پڑھ کر اس کی خرابیوں کا اس کو پتہ چلے گا تو وہ اس کا جواب تیار کرے گا، لوگوں کو بھی بتائے گا؛ لیکن جس کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے اس کی تو سلامتی اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو ان سے دور رکھے۔

---

(۱) أخرجه الدارمي برقم: ۴۴۹ (ط: دار المغني للنشر و التوزيع، المملكة العربية السعودية).

الحاصل ایسے اسباب جن سے ایمان میں شک وشبہ پیدا ہوسکتا ہے، وسوسے آسکتے ہیں ان سے بھی اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

کھڑکی کھلی رہ گئی:

مچھر بہت ہوں تو لوگ کیا کرتے ہیں؟ عصر کے وقت سے کھڑکیاں بند کر دیتے ہیں، اور اگر ایک آدھ کھڑکی بھی کھلی رہ گئی تو کیا کہیں گے؟ یار! آج تو مچھروں نے سونے نہیں دیا۔ کیوں بھائی؟ تو کہیں گے: کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ تو آپ اس طرح کھڑکیاں کھلی رکھیں گے تو ایسا ہی ہوگا۔

یہ وسوسہ کی پہلی قسم ہوئی کہ اگر وسوسے ویسے ہی آ گئے اور ہم ان کو برا سمجھ رہے ہیں تو ان کو برا سمجھنا یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہمارے دل میں ایمان ہے۔ اگر کوئی شخص اس کو برا نہیں سمجھے گا تو گیا ہاتھ سے۔ یہ وسوسہ کی پہلی قسم کا حل ہے۔

(۲) گناہ اور فسق وفجور سے متعلق:

(۲) وسوسہ کی دوسری قسم یہ ہے کہ گناہوں اور فسق وفجور کے وسوسے آئیں۔ یعنی آدمی کے دل میں خیال آئے کہ چوری کرلوں، شراب پی لوں، زنا کرلوں، قتل کرلوں۔ جو شخص اس لائن میں رہا ہو اور توبہ کر چکا ہو اس کو ایسے خیالات بہت آتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ ’’چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے۔‘‘

چناں چہ گناہوں اور فسق وفجور کے خیالات کے متعلق میں نے پہلی حدیث پڑھی تھی اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں جارہی ہیں، آپ کے دل میں خیال آیا کہ میں دیکھوں، بدنگاہی کروں۔ دیکھنے کا خیال آیا، دیکھا نہیں؛ اپنے آپ پر کنٹرول کیا، اور نہیں دیکھا تو اس

وسوسہ کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: إن اللہ تجاوز لي عن أمتي ما وسوست به صدورها ما لم تعمل أو تكلم. (قد مرّ تخريجه ص:٦٧) (اللہ تبارک وتعالیٰ نے میری امت سے معاف کر دیا ان چیزوں کو جن کے ان کے دلوں میں وسوسے آتے ہیں، جب کہ وہ ان پر عمل نہ کریں) جیسے کسی کو دیکھنے یا زنا کرنے کا خیال آیا کہ میں فلاں عورت سے زنا کروں؛ لیکن اپنے آپ کو اس سے روکا اور زنا نہیں کیا۔ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، دل نے چاہا کہ ذرا فلاں کی برائی کرلوں، لیکن اپنے آپ کو روک دیا، کنٹرول کرلیا، تو محض اس خیال سے گناہ نہیں ہوگا جب تک اس کو اپنی زبان سے ادا نہ کریں۔ بولنے کی چیز ہے اور بولوگے تو گناہ ہوگا، کرنے کی چیز ہے کروگے تو گناہ ہوگا۔ کرنے کا گناہ تھا، نہیں کیا تو گناہ نہیں، بولنے کا گناہ تھا، نہیں بولے تو گناہ نہیں۔ چناں چہ یہ فسق و فجور کے خیالات کا حل ہے۔

......تو کوئی گناہ نہیں:

کون ایسا ہے جس کو گناہ کا خیال نہ آتا ہو؟ کوئی بڑے سے بڑا بزرگ بھی ہوگا تو اس کے دل میں بھی خیالات اور وسوسے تو آئیں گے۔ دوسری حدیث حضرت ابن عباسؓ کی پیش کی: أن رجلاً سأل النبی ﷺ أحدث نفسی بالشیئ لأن أكون حممةً أحب إلي من أن أتكلم به. [1] (ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: میں اپنے جی میں کچھ باتیں کرتا ہوں، میں جل کر کوئلہ ہوجاؤں یہ مجھے زیادہ پسند ہے بنسبت اس کے کہ میں ان باتوں کو اپنی زبان سے بولوں) جیسے بعضوں کے دل میں چکر چلتا ہے کہ فلاں عورت سے صحبت کا موقع مل جائے تو مزہ آجائے، یہ دل میں خیال آیا، غیر اختیاری خیال بھی آتا ہے۔ اسی طرح کسی کو

(۱) قد مر تخريجه في ص:٦٨.

چوری کی عادت رہی ہو اور توبہ کر چکا ہو تو اب خیالات آتے ہیں کہ فلاں جگہ بڑا اچھا مال ہے، فلاں مول (Mall)، شوروم میں ہاتھ مارنے کا بڑا اچھا موقع ہے، ذرا مار لینا چاہیے۔ یہ صرف دل میں خیال آیا اور اس سے اپنے آپ کو روکا، عمل نہیں کیا تو کوئی گناہ نہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ......:

جو شخص نیکی میں مشہور ہو جیسے میں کہوں کہ میرے دل میں خیال آیا کہ فلاں عورت کو دیکھوں، یا کوئی اور آدمی جو نیکی میں مشہور ہے، کیا کسی کے سامنے ایسے خیال کا اظہار کر سکتا ہے؟ اپنے پکے اور لنگوٹیے دوست کے سامنے بھی اظہار نہیں کرے گا۔ یہ تو وہ جانے اور اللہ جانے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ بولوں گا تو وہ کہے گا کہ ایسے ہی بزرگ بنا پھرتا ہے!!! حاصل یہ ہے کہ ایسے خیال پر بھی حضور ﷺ نے فرمایا: الحمد للہ الذی رد أمرہ إلی الوسوسة. (قدمر تخریجہ فی ص:۶۸) (اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس کا معاملہ وسوسے تک رکھا) یعنی شیطان تو آیا تھا؛ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

دیکھیے! شیطان صرف وسوسہ ڈالنے کے لیے نہیں آتا؛ بلکہ وہ تو اس لیے آتا ہے کہ میں اس کے پاس یہ کام کروا کر ہی جاؤں گا؛ لیکن اس نے شیطان کا اتنا تو مقابلہ کیا کہ وہ کام اس نے نہیں کیا۔ وسوسہ سے تو اپنے آپ کو بچا نہیں سکا؛ لیکن اس کام سے اس نے اپنے آپ کو بچا لیا۔

اثر یکساں نہیں ہوتا:

دیکھیے! جیسی چیز ہوتی ہے اثر بھی اسی کے مطابق ہوتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اثر کرنے والے کا اثر، اور جو چیز اس

کا اثر قبول کرتی ہے دونوں سے بڑا فرق پڑتا ہے۔ (۱) جیسے ایک بڑا پتھر لے کر آپ نے مارا، سامنے اگر شیشہ ہے تو چکنا چور ہو جائے گا۔ اور اگر شیشہ نہیں؛ بلکہ کوئی اور خوب صورت چیز ہے، تو وہاں نشان پڑ جائے گا؛ لیکن وہ ٹوٹے گا نہیں۔ یا جیسے دوپہر کی سخت گرمی ہے، جون کی گرمی ہے، اوپر سے سورج کی شعاعیں آتی ہیں تو کیا ہوتا ہے؟ پتھر ہے تو گرم ہو جائے گا، اور اگر پیتل ہے تو اور زیادہ گرم ہوگا۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ پیتل کا بھیجا ہے، بہت جلدی گرم ہو جاتا ہے۔ لکڑی ہے تو وہ بھی گرم ہو جائے گی، یہاں تک کہ یہ زمین، مٹی وہ بھی گرم ہوتی ہے؛ لیکن پتھر زیادہ گرم ہوگا، پیتل اس سے زیادہ گرم ہوگا، لکڑی ان سے کم گرم ہوگی۔ مٹی گرم ہوتی ہے تو اس پر ہم جیسے شہر میں رہنے والے جو کھلے پاؤں چلنے کے عادی نہیں ہوتے، نہیں چل پاتے۔ دیہات والے تو چل لیتے ہیں۔ جیسی جگہ اس کے مطابق اثر ہوتا ہے۔ اور پتھر کی ایک قسم وہ بھی ہے جو کسی قسم کا اثر قبول نہیں کرتی، آپ حج و عمرہ کرنے گئے ہوں گے، وہاں مطاف میں سفید پتھر لگے ہوئے ہیں، وہ مصنوعی (artificial) نہیں ہیں، قدرتی ہیں، ایسا پہاڑ اللہ نے پیدا کیا ہے جو سورج کی شعاؤں کو اپنے اندر جذب ہی نہیں ہونے دیتا، ٹھنڈا ہی رہتا ہے، ان شعاعوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسے ہی شیطان آدمیوں پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ اب آدمی آدمی میں فرق ہے، کوئی پیتل جیسا، کوئی لوہے جیسا، کوئی پتھر جیسا، کوئی لکڑی جیسا اور کوئی حرم میں لگے ہوئے مرمر کے پتھر کی طرح ہوتا ہے۔ ورنہ شیطان تو آتا ہے، اور پورے حوصلے کے ساتھ آتا ہے کہ اس سے تو میں یہ کام کروا کر ہی جاؤں گا۔ زنا کروا کر ہی جاؤں گا؛ لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتا۔ دل میں صرف

---

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ: ۱/ ۲۸۲ (ط: دار الجیل، بیروت، لبنان)

وسوسہ آیا تو اس کو حضور ﷺ نے فرمایا: الحمد لله الذي رد أمرهٗ إلى الوسوسة. (اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس معاملہ کو وسوسہ تک رکھا)

جان تو بچ گئی:

اس کو ایک مثال سے یوں سمجھو کہ کسی کے گھر پر رات کو چوروں نے حملہ کیا، خوب پٹائی کی، ٹانگیں توڑ ڈالیں، ہاتھ توڑ ڈالے، وہ اسپتال میں داخل ہے، آپ اس کی عیادت کے لیے گئے اور پوچھا کہ بھائی! کیا حال ہے؟ تو کہتا ہے کہ الحمد للہ! جان بچ گئی۔ یہ الحمد للہ کس چیز پر ہے؟ تیری ٹانگیں ٹوٹ گئیں، تیرا ہاتھ ٹوٹ گیا!! تو وہ کہتا ہے: ٹانگیں اور ہاتھ ٹوٹ گئے اس کا تو علاج ہو جائے گا، جان تو بچ گئی۔ چناں چہ صرف وسوسہ آیا؛ لیکن وہ کام نہیں کیا، تو بہت سی مرتبہ اللہ تعالیٰ خالی وسوسہ کے ذریعہ سے ہم کو بچا لیتے ہیں۔

بانیکاں بنشیں:

بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ مولانا! دعا کیجیے نا! یہ برے برے خیالات آویں ہی نہیں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ ارے اللہ نے انسان کو پیدا ہی ایسا کیا ہے، تبھی تو انسان کا کمال ہے کہ اس میں گناہ کی صلاحیت ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اس سے بچاتا ہے۔ یہ دوسری قسم جس میں گناہوں اور فسق وفجور کے خیالات آتے ہیں، ان میں اپنے آپ پر کنٹرول کیا تو ان خیالات کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ بہت سے لوگ ایسے خیالات کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں۔ البتہ یہ ضرورت ہے کہ ایسے خیالات بھی نہیں آنے چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں اپنا ماحول سدھارنے کی ضرورت ہے۔ بہت سے لوگ دین دار ہوتے ہیں؛ لیکن پھر بھی تھوڑی دیر چاشنی حاصل کرنے کے لیے دوسری پارٹی میں

بیٹھ جاتے ہیں، اور وہاں باتیں ہونے کی وجہ سے اس کا دماغ بھی ٹک ٹک کرتا ہے کہ ان کی بات تو صحیح ہے، ذرا ایک مرتبہ ان کے ساتھ چوپاٹی پر ہو آویں۔ بھائی! آپ کو تو اس ماحول میں جانا ہی نہیں تھا۔ جیسے میں نے کہا کہ ہمیں اپنے ایمان اور اپنے نیک عمل کی حفاظت ہیرے جواہرت سے زیادہ کرنی ہے۔ نہ ایسے آدمیوں کی صحبت میں رہو، نہ ایسا ماحول اختیار کرو، ہر برائی سے اپنے آپ کو دور رکھو۔

بہر حال! یہ وسوسہ کی دوسری قسم ہے، اس کا حکم بھی یہی ہے کہ ہم اس کے تقاضہ پر عمل نہ کریں۔ **لیکن یاد رکھنا! آدمی اگر اپنا ماحول نہیں بدلے گا تو پھر دھیرے دھیرے وہ پھنس ہی جائے گا، اور اس کا نظریہ بدل جائے گا۔**

(۳) بے موقع وسوسہ:

(۳) وسوسہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ وہ وسوسہ تو ہے؛ لیکن گناہ کا نہیں ہے۔ بلکہ بے موقع آیا۔ اللہ أکبر کہہ کر نماز کی نیت باندھی، اور پہنچ گئے دکان پر۔ تو دکان کا خیال کوئی گناہ کا خیال نہیں ہے۔ گھر میں پہنچ گئے، بیوی کے ساتھ باتیں ہو رہی ہیں، اور الحمد بھی پڑھی جا رہی ہے، تو بیوی کے ساتھ باتیں کرنا کوئی گناہ کا کام نہیں ہے؛ لیکن وہ نماز میں ہو رہا ہے، بے موقع ہو رہا ہے۔ یہ تیسری قسم ہے۔ اس سے بھی لوگ بہت پریشان ہیں۔ اور اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ ہم نے اپنی نماز پر جو محنت کرنی چاہیے تھی وہ نہیں کی ہے۔ نماز میں ایسے خیالات نہ آویں، یہ مفت میں نہیں ہوگا۔ اس دھیان کے لیے محنت کرنی پڑے گی، نماز میں جو پڑھا جا رہا ہے اس کی طرف توجہ کرنی پڑے گی۔

نماز؛ایک شیڈیول:

نماز کا ایک شیڈیول ہے۔آپ استنجا کرتے ہیں،اس کے بعد وضو کرتے ہیں،اس کے بعد فرض نماز سے پہلے سنت پڑھتے ہیں،پھر فرض پڑھنے تک کا پورا پروگرام ہے۔آپ دعوت کھانے جاتے ہیں،تو شاندار قسم کی دعوتوں میں کیا ہوتا ہے؟ پہلے سوپ آیا،وہ ابھی تھوڑا سا چکھا کہ کچھ اور آیا۔ایک ساتھ سب نہیں آتا،دھیرے دھیرے لایا جاتا ہے،وہ آپ کی بھوک کو کھولنا چاہتے ہیں۔اسی طرح نماز کی بھی شریعت نے ایک ترتیب رکھی ہے۔

ہمارا حال کیا ہے؟اذان تو کب سے سن لی ہے،اب اگر ہم اذان سنتے ہی تیاری کر لیتے،یا اذان سے پہلے ہی تیاری کر لیتے تو آسان تھا؛لیکن اذان سننے کے بعد بھی بیٹھے رہیں گے۔پانچ دس منٹ باقی ہے اس وقت آئے،اب پیشاب کا تقاضہ ہے،تو سیدھے استنجا خانہ میں چلے گئے،یہاں نماز کھڑی ہوگئی،اور ابھی تو قطرے بند ہوئے بھی نہیں کہ پانی ڈال دیا۔

شیطان بڑا اچٹوریا ہے:

باقی رہنے والے قطروں کا مستقلاً مسئلہ ہے،اہل علم سے پوچھو،جب تک مکمل طور پر قطرہ نکلنا بند نہ ہو جائے تب تک پانی ڈالنا درست نہیں ہے۔اس کو استبراء کہتے ہیں،یعنی پیشاب پوری پوری نکل جائے۔آدھی نکلی اور آدھی باقی رہی اور پاجامہ پہن لیا تو پاجامہ بھی ناپاک ہوگا،جب پاجامہ ناپاک ہے تو نماز کہاں درست ہوئی؟ یہ بھی ایک شیڈیول ہے،ہمیں اس کو اپنانا ہے۔تو شیطان کے وسوسوں کی شروعات یہیں سے ہوتی ہے کہ شیطان خود ناپاک ہے،اور ہم نے ناپاکی شروع سے ہی رکھی،تو شیطان کو وسوسے ڈالنے کا مزید موقع

مل گیا۔ شیطان بڑا چٹوریا ہے، اس کو یہ گندگی بہت اچھی لگتی ہے۔ اس لیے ہمیں استنجاء کے معاملے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ احتیاط بھی نہیں جو وہم والے کرتے ہیں کہ ایک ایک گھنٹہ تک ختم نہ ہو، لیکن شریعت کی حد میں رہ کر احتیاط رکھنا ہے۔

وضو میں اسراف؛ خشوع ختم:

ہمارے وضو کے طریقے، اللہ کی پناہ!!! باتیں ہو رہی ہیں، نل کھول دیا ہے، پانی گرتا جا رہا ہے۔ آپ کتابوں میں پڑھیے! **وضو میں ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کرنا جس کو پانی کی فضول خرچی کہتے ہیں، اگر یہ پانی اپنا ہو تو مکروہ تحریمی ہے اور مسجد کا ہو تو حرام ہے۔** مسجد کا پانی وقف ہے، ہمیں اتنا ہی پانی استعمال کرنے کی اجازت ہے، جس سے ہمارا وضو ہو جائے، اور ہم نل کھول کر بیٹھے ہیں، باتیں کر رہے ہیں۔ وضو شروع کرنے سے پہلے دس بالٹیاں پانی تو ویسے ہی ضائع ہو جاتا ہے۔

پانی کے ضیاع اور بربادی کی نحوست یہ ہوتی ہے کہ آدمی کی نماز سے خشوع اور خضوع نکل جاتا ہے۔ **پانی کے بے جا استعمال کو خشوع کے نکالنے میں بڑا دخل ہے۔** جس نماز کی شروعات ہی حرام کام سے ہوئی وہ نماز کیسی ہوگی؟ اس لیے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ نماز میں پڑھنا شروع کریں تو ہمیں اپنا دھیان پڑھنے میں لگانا چاہیے۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ اللہ اکبر کہا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹیپ ریکارڈ کی سوئچ آن کر دی، ادھر ہماری زبان چل رہی ہے سبحانک اللھم وبحمدک الخ۔۔ اور دل کہاں گھوم پھر رہا ہے؟ کہاں باتیں ہو رہی ہیں؟ کہیں چائنا خریدی کرنے جانا تھا تو اسی نماز میں پورا سفر بھی ہو گیا۔ یہ کیا ہے؟ نماز میں دھیان لگانے کے لیے جو محنت کرنی تھی وہ آج تک کبھی ہم نے کی ہی نہیں۔

لگے رہو......:

ابھی میری تقریر سنی تو ہر ایک کو دل میں خیال آئے گا کہ یار! بات تو صحیح ہے، نماز میں دھیان لگانا چاہیے۔تو اب کیا کریں گے؟اب تو میں صبح کی نماز بہت دھیان لگا کر پڑھوں گا۔ اب نیت باندھی اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الفاتحة : ۱) پڑھا، بہت دھیان سے پڑھا۔اور الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ .(الفاتحة : ۲) پڑھے اتنی دیر میں تو گاڑی پٹری سے اتر گئی۔کہاں دھیان چلا گیا وہ بھی یاد نہیں رہا، ایسا دھیان گیا کہ ساری نماز پوری ہوگئی تو بھی یاد نہیں آیا، دو دن کے بعد یاد آیا کہ ارے! نماز تو دھیان سے پڑھنی تھی۔آج سے دو دن پہلے خیال آیا تھا وہ اب آیا، کوئی بات نہیں! آپ لگے رہو۔ بھول ہوگئی، ٹھیک ہے۔آج یہ ہوگا کہ الرحمٰن الرحیم تک گاڑی پٹری پر رہی۔ پھر مٰلك يوم الدين آیا اور اتر گئی؛ لیکن آپ لگے رہو۔۔۔۔لگے رہو۔۔۔۔۔ایک دن آئے گا کہ آپ کا دھیان نماز میں لگ جائے گا۔

من جدّ و جد:

ہر چیز کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ایک آدمی بڑا تاجر ہے، اس کی بڑی دکان ہے تو کیا ایک دن میں وہ بڑا تاجر بن گیا؟ دکان بن گئی؟ نہیں۔نوساری کے ہمارے ایک ملنے والے دوست تھے، ان کی کپڑے کی بڑی اچھی دکان تھی، وہ اپنا واقعہ بڑے شوق سے بیان کرتے تھے کہ مولانا! میں تو پہلے وہاں فٹ پاتھ کے اوپر پتھارا لگا کر ماچس بیچتا تھا۔اس کے بعد یوں ہوا۔۔۔اس کے بعد یوں ہوا۔۔۔۔

یہ امبانی پہلے دن میں بن گیا؟ نہیں، اس نے معلوم نہیں کتنی محنتیں کی ہوں گی۔
حاصل یہ ہے کہ <u>دنیا ہو یا کوئی اور چیز ہو، آپ کو محنت کے بغیر ملتی نہیں ہے۔تو نماز میں جی</u>

لگانے کے لیے محنت کرنی پڑے گی، جو آج تک ہم نے نہیں کی۔ہم تو یوں چاہتے ہیں کہ بس ایک ہی دن میں ہمارا ایسا جی لگے کہ ہم ساتویں آسمان پر پہنچ جائیں۔نہیں بھائی! ساتویں آسمان پر پہنچنا آسان نہیں ہے۔

آدمی کا ذہن کیسا بنا ہے؟ کوئی چیز آدمی کے شوق کی ہو، جیسے آپ کو کرکٹ کا شوق ہے اور اخبار میں کرکٹ کی تفصیل آئی ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ اس تفصیل کے پڑھنے کے دوران کوئی دوسرا خیال بھولے سے بھی آپ کو نہیں آئے گا۔ کیوں؟ اس لیے کہ کسی چیز کو پڑھنے کے لیے جتنا دھیان دینے کی ضرورت ہے، وہ ۱۰۰% دھیان آپ اس وقت لگا رہے ہیں۔ اس لیے کہ آپ کے شوق کی چیز ہے، اس میں آپ کا دھیان لگتا ہے تو دوسرا خیال آئے گا ہی نہیں۔ اور جو چیز آپ کے دھیان کی نہیں ہے، جیسے قرآن لے کر بیٹھے، آپ کا جی نہیں لگتا تو ہماری توجہ کے سو (۱۰۰) حصے ہیں، ان میں سے ۱۰ حصے قرآن کی پڑھائی میں لگے ہیں تو باقی کے ۹۰ بے کار نہیں رہیں گے، وہ اپنی جگہ ڈھونڈیں گے، چناں چہ اس میں دوسرے خیالات آئیں گے۔ اس لیے ہمیں محنت کرنی ہے اور کرتے کرتے 100 فی صد ہمارا دھیان نماز میں آجائے تب تک ہم چین سے نہ بیٹھیں۔ پھر کوئی خیال نہیں آئے گا۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست:

ایسے خیالات کی وجہ سے نماز ٹوٹتی تو نہیں ہے؛ لیکن ان سے غافل بھی نہیں ہونا چاہیے، اور پریشان بھی نہیں ہونا چاہیے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ میری نماز کیا ہے؟ خالی اٹھک بیٹھک ہے، خالی سر ٹکرانا ہے۔ ارے بھائی! سر ٹکرانا ہے تب بھی کیا ہوا؟ اللہ نے آپ کو اپنے دربار میں حاضری کی توفیق دی، تو اس کا شکر ادا کرو، بہت سارے وہ ہیں جن کو یہ

<u>سعادت نصیب نہیں ہوتی۔ اللہ نے ہم کو توفیق دی اس معنیٰ کر یہ بڑی سعادت کی چیز ہے۔ البتہ اس کے لیے جتنی محنت کرنی چاہیے تھی وہ نہیں ہو سکی، یہ ہماری کمزوری ہے، ہمارا فولٹ (fault) ہے اس کو ہمیں دور کرنا ہے۔</u>

من آنم کہ من دانم:

بہر حال! ان خیالات کی وجہ سے اگر چہ نماز نہ ٹوٹے؛ لیکن ہمیں کوشش یہی کرنی چاہیے کہ اس کی بھی نوبت نہ آنے پائے۔ اور کوشش کے باوجود خدانہ کرے، خدانہ کرے خیالات آتے ہیں، تو اس کی وجہ سے-ان شاء اللہ- نماز فاسد نہ ہوگی، ہمارا فریضہ ادا ہو جائے گا۔ <u>ہماری ایسی نماز جس میں دو منٹ بھی ہمارا دھیان نہیں ہوتا، اس کے باوجود ہم دوسروں کو کتنا حقیر سمجھتے ہیں!! اللہ نے دو رکعت پڑھنے کی توفیق دی؛ حالاں کہ وہ دو رکعت کیسی ہیں، وہ تو ہم ہی جانتے ہیں! اللہ جانتا ہے! لیکن دو رکعت پڑھ کر دوسروں کو ہم حقیر سمجھتے ہیں کہ میں کچھ ہوں، میں بڑا اچھا ہوں، مجھ جیسا کوئی نہیں۔ اب جس نماز کو پڑھ کر دوسروں کی تحقیر آئے آپ بتایئے! پھر کیا ہوگا؟</u>

بہر حال! نماز میں خیالات کی یہ تین چیزیں تھیں، اس میں اور بھی بہت کچھ تفصیل ہے، مختصر طور پر آپ کو بتادیا۔ اس سلسلہ میں محنت کرو، نماز میں دھیان لگاؤ، اللہ سے دعائیں کرو، شیطان سے بچنے کے لیے بھی سورۂ ناس پڑھتے رہو، اس کے شر اور اثرات سے بچنے کے لیے بار بار اس کو پڑھو۔ ایسا ماحول، ایسی چیزیں جن کی وجہ سے یہ برائیاں آسکتی ہیں ان سے اپنے آپ کو دور رکھو ان شاء اللہ ایمان کی بھی حفاظت ہوگی، اور اعمال کو بھی صحیح طریقہ سے انجام دینے کی توفیق ہوگی۔

اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ اخلاص

(مؤرخہ: ۱۷؍شوال المکرم ۱۴۳۹ھ مطابق ۳۰؍جون ۲۰۱۸ء شبِ یک شنبہ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ من شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا وَ نَعُوذُ بِاللّٰہِ من شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ أَنْ لَّآ إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ أَرْسَلَہٗ إِلٰی کَافَّۃِ النَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَ دَاعِیًا إِلَی اللّٰہِ بِإِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا صَلّٰی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ أَصْحَابِہٖ وَ بَارَکَ وَ سَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا. أَمَّا بَعْدُ.

أعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم. بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم.

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴿۱﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ﴿۲﴾ لَمْ یَلِدْ ۙ وَ لَمْ یُوْلَدْ ﴿۳﴾ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾

یہ سورۂ اخلاص ہے، اس میں چار آیتیں ہیں۔ اور راجح قول کے مطابق مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے۔ جس وقت اللہ تبارک و تعالیٰ نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو پورے عرب؛ بلکہ پوری دنیا میں لوگ بت پرستی میں مبتلا تھے، اپنے ہاتھوں سے بتوں کو بناتے تھے، پتھر کے بت، لکڑی کے بت اور دیگر اشیاء کے، اور پھر انہی کی عبادت کرتے تھے، انہی کو اپنا حاجت روا اور کارساز سمجھتے تھے۔ ایسے ماحول میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آ کر لوگوں کو ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دی۔

عقیدۂ توحید:

توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو توحید کی طرف بلایا اور کہا: ایک اللہ کی عبادت کرو، اسی کی اطاعت وفرماں برداری کرو، اسی کے احکام کو اپناؤ۔ چناں چہ وہ لوگ جس ماحول میں تھے، اس اعتبار سے ان میں سے بعض کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اوران لوگوں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات عالی کے متعلق کچھ ناروا اور نامناسب سوالات کیے۔

شانِ نزول:

(۱) دو آدمی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے، اور انھوں نے سوال کیا کہ آپ جس خدا کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں -نعوذ باللہ- وہ کس سے بنا ہے؟ سونے سے؟ چاندی سے؟ لوہے سے؟ لکڑی سے؟ تو ان کے اسی سوال کے جواب میں یہ سورت اللہ تبارک وتعالیٰ نے نازل فرمائی۔[۱] اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اپنا تعارف کرایا ہے۔

(۲) بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ تبارک تعالیٰ کے حسب ونسب کے متعلق سوال کیا۔ دنیا میں ہم جب کسی آدمی کا تعارف اور پہچان کرنا چاہتے ہیں، تو پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو؟ تمہارا باپ کون ہے؟ تمہارا خاندان کیا ہے؟ چناں چہ بعض لوگوں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات عالی کے متعلق اسی

---

(۱) أخرجه أبو الشيخ في العظمة عن أنس رضي الله عنه ۱/ ۳۷۰ [۸۲] (ط: دار العاصمة، الرياض)

طرح کے سوال کیے۔ اس کے جواب میں اللہ تبارک تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ [۱]

واحد اور احد میں فرق:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ.

اے نبی! آپ کہہ دیجیے! ان لوگوں کو بتلایئے! کہ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے ایک ہے۔

یہاں اللہ احد کہا۔ حضرات مفسرین اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ لفظ واحد استعمال نہیں کیا، لفظ احد استعمال کیا، بظاہر لفظ واحد اور احد میں ہمیں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا؛ لیکن حضرات مفسرین لکھتے ہیں کہ لفظ "واحد" اثنین، ثلثة اور اربعة، دو، تین، چار کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ ایک سے مافوق تمام اعداد کے مقابلہ میں واحد یعنی ایک بولا جاتا ہے۔ اور احد اس ذات کے لیے بولا جاتا ہے، جس کا کوئی جز نہ ہو۔ [۲] بعض مرتبہ کوئی چیز ایک تو ہوتی ہے؛ لیکن وہ مختلف اجزاء سے بنی ہوئی ہوتی ہے۔ جیسے کرسی ہے، اس کے پائے ہیں، دستہ ہے، بیٹھنے کی جگہ ہے، پیچھے ٹیک لگانے کی جگہ ہے، کئی چیزوں، اجزاء اور پارٹس (parts) کے مجموعہ سے تیار ہوئی ہے۔ تو یہ واحد تو ہے؛ لیکن اس کو احد نہیں کہیں گے۔ **احد اسی کو کہیں گے جس کا کوئی جز نہ ہو، جو بسیط ہو۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے لفظ احد استعمال کیا، گویا اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے ایک ہے۔** وہ لوگ تو کئی معبودوں کے قائل تھے۔ وہ تو ہیں ہی نہیں؛ لیکن اللہ کی ذات کی وحدانیت ایسی ہے کہ اس کا کوئی

---

(۱) أخرجه الترمذي في سننه برقم: ۳۳۶۴ (ط: مصطفىٰ البابي الحلبي، مصر) و البخاري فی التاريخ الكبير: ۱/ ۲۴۵ [۷۷۸] (ط: دائرة المعارف العثمانية، حيدرآباد، دكن).

(۲) النهاية فی غريب الحديث والأثر لابن الأثير: ۱/ ۲۷ (ط: دار المكتبة العلمية، بيروت).

جز بھی نہیں ہے، اجزاء سے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پاک اور منزّہ ہے۔

عربی زبان میں مترادف نہیں:

اللہ الصمد

عام طور پر الصمد کا ترجمہ بے نیاز کرتے ہیں، لیکن حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ بے نیاز والا ترجمہ صمد کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ عربی زبان ایسی عجیب وغریب زبان ہے کہ اس کے کلمات جس مفہوم کو ادا کرتے ہیں، اس مفہوم کو مکمل طور پر ادا کرنے کے لیے بسا اوقات ہماری اردو زبان میں کوئی ایک لفظ نہیں ہوتا۔ اسی لیے بعض حضرات تو فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں کوئی مترادف (ہم معنیٰ لفظ synonym) نہیں ہے۔ دو لفظ ہیں، لوگ تو یوں سمجھتے ہیں کہ جو مطلب اس کا ہے وہی مطلب دوسرے کلمہ کا بھی ہے، دونوں کلمے بظاہر ایک مفہوم اور معنیٰ کو ادا کرتے ہیں؛ لیکن جب ان کے مفہوم میں غور کیا جاتا ہے، تو ہر ایک کے مفہوم میں کوئی ایک بات ایسی ہوتی ہے، جو دوسرے میں نہیں پائی جاتی۔ کوئی بھی کلمہ دوسرے کلمہ کے ساتھ من کل الوجوہ مترادف نہیں ہوتا۔ مترادف ایسے کلمے کو کہتے ہیں کہ دوسرا کلمہ اسی مفہوم اور اسی مطلب کو ہو بہو ادا کرتا ہو، چناں چہ عربی کے ہر کلمہ میں کچھ ایسی بات ہوتی ہے جو دوسرے میں نہیں ہوتی۔ لیکن اس پہلو کو چھوڑ کر لوگ اکثری اعتبار سے مترادف کہتے ہیں؛ لیکن حقیقۃً وہ مترادف نہیں۔

صمد کا معنیٰ:

آگے لفظ صمد مذکور ہے، صمد عربی زبان میں ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ تمام مخلوقات اپنی ضرورتوں میں اس کی محتاج ہوں اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ دونوں باتیں ہیں:

وہ کسی کا محتاج نہیں، اور سب اس کے محتاج ہیں۔ **اب حضرت مفتی تقی صاحب** دامت برکاتہم **فرماتے ہیں کہ جب ہم ترجمہ کرتے ہیں بے نیاز، تو بے نیاز کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں؛ لیکن "سب اس کے محتاج ہیں" وہ معنیٰ اس ترجمہ میں نہیں آیا۔ گویا لفظ بے نیاز سے جب لفظ صمد کا ترجمہ کیا جائے گا، تو کلمۂ صمد کا جو مفہوم ہے وہ پورے طور پر ادا نہیں ہوتا؛ بلکہ اس میں کمی رہ جاتی ہے۔** اور یہاں وہی بتلانا مقصود ہے کہ تمام مخلوقات اپنی تمام ضرورتوں میں اللہ تعالیٰ کی محتاج ہیں اور اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ چناں چہ حضرت مفتی تقی صاحب دامت برکاتہم اس کا ترجمہ اسی طرح کرتے ہیں: اللہ ہی ایسا ہے کہ سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔ (۱) یہاں الصمد کا ترجمہ انہوں نے بے نیاز نہیں کیا؛ بلکہ کلمۂ الصمد کا مقصود ادا کیا۔ تو اس میں ان لوگوں کا جواب آ گیا کہ اللہ تعالیٰ نہ تو سونے سے بنے ہیں، نہ تو چاندی سے بنے ہیں۔ اس لیے کہ اگر کوئی چیز سونے سے بنتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سونا پہلے وجود میں آیا، اور وہ چیز اپنے بننے میں سونے کی محتاج ہے۔ اگر چاندی سے بنی ہوئی ہے، تو گویا پہلے چاندی کا وجود ہوا، اور وہ چیز جو چاندی سے بنی ہے اپنے بننے میں، اپنے وجود میں چاندی کی محتاج ہے۔ تو احتیاج ثابت ہوئی، اور اللہ تعالیٰ کی ذات تو بے نیاز ہے!!! گویا اللہ کسی کا محتاج نہیں، اور سب چیزیں اس کی محتاج ہیں یہ کہہ کر دونوں طرف سے ایسا مفہوم بتلایا گیا کہ اب اس کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو انہوں نے قائم کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کس سے بنے ہیں؟ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

---

(۱) توضیح القرآن آسان ترجمۂ قرآن از حضرت عثمانی دامت برکاتہم۔

نہ جنا، نہ جنا گیا:

لَمۡ یَلِدۡ ۙ۬ وَ لَمۡ یُوۡلَدۡ۔

نہ اللہ نے کسی کو جنا، یعنی نہ اللہ کی کوئی اولاد ہے **ولم یولد** نہ اللہ جنا گیا، یعنی اللہ کسی کی اولاد نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی بھی اولاد نہیں۔ جو سوال کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا حسب و نسب کیا ہے؟ اللہ کا نسب بتلاؤ۔ ان کے باپ کون ہیں؟ دادا کون ہیں؟ تو کہا: اللہ تعالیٰ کسی سے پیدا ہی نہیں ہوئے۔ اب عربوں میں یا بعض اور دینوں میں کسی کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا جاتا ہے، جیسے خود عرب کے لوگ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ تو **لم یلد** (اللہ نے کسی کو نہیں جنا) سے اس کی نفی ہوگئی۔ یا جیسے عیسائی ہیں، حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ و السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں، **لم یلد** کہہ کر اس کی بھی نفی ہوگئی۔ اور اسی طریقے سے یہودی حضرت عزیر علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں، اس کی بھی نفی ہوگئی۔ اللہ نے کسی کو نہیں جنا۔

وَ لَمۡ یُوۡلَدۡ (اور نہ وہ کسی سے جنا گیا) تو اس سے ان لوگوں کی الوہیت کی بھی نفی ہو گئی، جب یہ لوگ دوسروں سے پیدا ہوئے ہیں، تو وہ معبود اور خدا نہیں بن سکتے۔

اس کا ہمسر کوئی نہیں:

وَ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ (اور کوئی بھی اس کے جوڑ کا اور ہم سر نہیں ہے)

کفو اس کو کہتے ہیں کہ دو شخصیتوں کا اپنے کمالات و اوصاف میں ایک دوسرے کے برابر ہونا۔ کوئی کسی چیز میں کسی سے کم نہ ہو۔ اس عالم میں اور کائنات میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی برابری کا دعویٰ کر سکے۔ گویا کوئی اللہ کے جوڑ اور برابری کا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان تنہا

اور یکتا ہے۔ کسی صفت وخوبی اور کمال میں کوئی اللہ کے مشابہ نہیں ہوسکتا، اس کی نفی ہوگئی۔

دو چیزیں خاص طور پر ہیں: احدیت اور صمدیت۔ اللہ اکیلا ہے اور کوئی اس کے مشابہ نہیں ہے، کوئی اس جیسا نہیں ہے، کسی میں وہ کمالات نہیں ہیں جو اللہ کے اندر ہیں، اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، اللہ ہی عبادت کے لائق ہیں۔ اور صمد کا مطلب یہ ہے کہ سب لوگ اس کے محتاج ہیں اور اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ اور اخیر میں کوئی اس کا ہم سر نہیں ہے کہہ کر اس کفو کی بھی نفی کر دی ہے۔ **اس طرح اس سورت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے وہ صفات اور کمالات بیان کیے گئے ہیں کہ کوئی دوسرا اس میں اللہ تعالیٰ کا شریک اور ساجھے دار نہیں ہے، اسی معنیٰ کر کے اس کو سورۂ اخلاص سے تعبیر کیا جاتا ہے۔**

فضائلِ سورۂ اخلاص:

اور اس سورت کے بڑے فضائل ہیں، اب سورۂ اخلاص کے فضائل کے سلسلہ میں جو روایات وارد ہوئی ہیں، ان کو میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

تہائی قرآن کے برابر:

(۱) حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے دوسرے سے قل ھو اللہ احد سنی، پڑھنے والا اس کو بار بار پڑھ رہا تھا۔ جب صبح ہوئی تو یہ (سننے والا) نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آپ ﷺ سے عرض کیا کہ فلاں شخص رات کو بار بار سورۂ قل ھو اللہ احد پڑھ رہا تھا۔ اور پوچھنے والے کا بیان کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس کے اس بار بار پڑھنے والے عمل کو کم اور معمولی سمجھ رہا تھا، اس لیے اس نے ایسے انداز سے بیان کیا تو نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **بے شک یہ سورت تہائی قرآن کے برابر**

ہے، **یعنی اس کے پڑھنے پر تہائی قرآن پڑھنے کا ثواب ملے گا۔** گویا سائل کا مقصد تو کچھ اور تھا، وہ تو یوں سمجھتا تھا کہ یہ بار بار کیوں پڑھ رہا ہے؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے اس کا یہ اجر و ثواب بتلا کر کے اس کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ (۱)

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت مسلم شریف میں ہے: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہیں تہائی قرآن پڑھ کر سناتا ہوں۔ صحابہؓ کو جمع کر کے آپ ﷺ نے یہ بات فرمائی تھی، اور اس کے بعد آپ ﷺ نے سورۂ قل ھو اللہ احد پوری پڑھ کر سنائی۔ (۲) **گویا یہ تہائی قرآن کے برابر ہے۔ اسی لیے ہمارے یہاں عام طور پر ایصال ثواب میں آسان تدبیر ہے کہ تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر اس کا ثواب میت کو پہنچایا جاتا ہے۔ تین مرتبہ پڑھنے سے حکماً، فضیلت کے اعتبار سے پورے قرآن کا ثواب مل جاتا ہے۔**

اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرماتے ہیں:

(۳) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں - یہ بھی مسلم شریف کی روایت ہے - کہ نبی کریم ﷺ نے ایک فوجی دستہ بھیجا، اور ایک آدمی کو اس کا امیر بنایا۔ یہ آدمی جب بھی نماز پڑھاتا تھا، تو ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی سورت پڑھنے کے بعد پھر قل ھو اللہ احد بھی پڑھتا تھا۔ گویا سورۂ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورت ملانے کو کافی نہیں سمجھا، اور ہر رکعت میں قل ھو اللہ احد بھی ضرور ملاتا تھا۔ اب یہ لوگ جب واپس آئے تو نبی کریم ﷺ سے لوگوں نے اس کا تذکرہ کیا تو آپ ﷺ نے اس آدمی سے پوچھا: تم ایسا کیوں کرتے تھے؟ اس نے جواب

---

(۱) أخرجه البخاري برقم: ۵۰۱۳.

(۲) أخرجه مسلم برقم: ۸۱۲.

میں کہا: **اس میں رحمٰن کی صفات بیان کی گئی ہیں، اس لیے میں اس سورت کو بہت محبوب جانتا ہوں کہ اس کو پڑھوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اسے بتادو کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرماتے ہیں۔** (۱)

(۴) ترمذی شریف کی روایت ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یہ روایت بیان کی اور یوں کہا کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں قل ھو اللہ احد سے محبت کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: **اس سورت سے تیری جو محبت ہے اس نے تجھے جنت میں داخل کر دیا۔** (۲)

(۵) حضرت کلثوم بن ہدم رضی اللہ عنہ جن کے گھر میں نبی کریم ﷺ نے قیام فرمایا تھا، ہجرت فرما کر جب آپ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے، تو آپ ﷺ کا پہلا قیام ۱۴؍روز تک قبا میں رہا، تو قبا میں حضور ﷺ نے ان کے گھر میں قیام فرمایا تھا۔ اور وہ قبا والوں کے امام تھے، جب نماز پڑھاتے تو سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی سورت پڑھنے کے بعد پھر قل ھو اللہ احد پڑھتے۔ تو لوگوں نے کہا: تم یہ سورت (قل ھو اللہ احد) پڑھتے ہو تو اسی کو پڑھو، دوسری سورت نہ پڑھو۔ تو انھوں نے جواب میں کہا کہ تم کو اگر میری امامت منظور ہے تو ٹھیک، میں تو اسی طرح پڑھوں گا، ورنہ میں الگ ہو جاتا ہوں۔ اور وہ ایسی شخصیت تھی کہ لوگ ان کی امامت چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ تو لوگوں نے پھر نبی کریم ﷺ سے شکایت کی کہ یہ ایسا کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے ان سے پوچھا، تو انھوں نے وہی جواب دیا: مجھے اس سورت کے ساتھ محبت ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ تو نبی کریم ﷺ

---

(۱) أخرجه مسلم برقم: ۸۱۳.

(۲) أخرجه البخاري تعليقاً في باب الجمع بين السورتين والترمذي برقم: ۲۹۰۱.

نے فرمایا: تمہاری اس محبت نے تم کو جنت میں داخل کردیا۔ (۱)

جنت میں دو محل:

(٦) حضرت سعید بن المسیبؒ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے دس مرتبہ قل ھو اللہ احد پڑھ لی، اس کے لیے جنت میں ایک محل بنادیا جائے گا، اور جس نے بیس مرتبہ پڑھ لی اس کے لیے جنت میں دو محل بنادیے جائیں گے۔ اور جس نے تیس مرتبہ پڑھی اس کے لیے جنت میں تین محل بنادیے جائیں گے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ کی قسم! اس صورت میں تو ہم دس دس مرتبہ یہ سورت پڑھ کر اپنے لیے بہت زیادہ محل بنالیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ بہت بڑا داتا ہے۔ جتنا عمل کروگے اس کے پاس اس سے بہت زیادہ انعام ہے۔ یعنی اللہ کے خزانے میں کوئی کمی نہیں، تم جتنے چاہو اپنے لیے محل بنوالو۔ (۲)

جنت واجب ہوگئی:

(٧) حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک آدمی کو سورۂ قل ھو اللہ احد پڑھتے ہوئے سن لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کے لیے واجب ہوگئی۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں: میں نے پوچھا: کیا واجب ہوا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جنت

---

(۱) أخرجه الترمذي برقم: ۲۹۰۱.

(۲) أخرجه الدارمي برقم: ۳۴۷۲، وهو حديث مرسل (ط: دار المغني للنشر و التوزيع، المملكة العربية السعودية).

واجب ہوگئی۔[1]

بہر حال! اس سورت کے بڑے فضائل ومناقب ہیں۔ اس لیے اس کے پڑھنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ روزانہ کم سے کم ایک تسبیح اس کی اگر پڑھ لیں تو اس سے-ان شاء اللہ- بڑا اجروثواب ہمارے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا۔

اس مختصر سی سورت میں اللہ تعالیٰ کے لیے خالص توحید کو ثابت کیا گیا ہے، اس لیے اس کو سورۂ اخلاص سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توحیدِ خالص کی نعمت سے مالا مال فرمائے۔

---

(۱) أخرجه الترمذي برقم: ۲۸۹۷.

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ لہب

(مؤرخہ ۱۷؍شوال المکرم ۱۴۳۹ھ مطابق ۳۰؍جون ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَ نَسۡتَعِیۡنُہٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُہٗ وَ نُؤۡمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیۡہ وَ نَعُوذُ بِاللّٰہ من شُرُوۡرِ أَنۡفُسِنَا وَ مِنۡ سَیِّاٰتِ أَعۡمَالِنَا وَ نَعُوذُ بِاللّٰہ من شُرُوۡرِ أَنۡفُسِنَا وَ مِنۡ سَیِّاٰتِ أَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشۡھَدُ أَنۡ لَّآ إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَ نَشۡھدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَ رَسُوۡلُہٗ أَرۡسَلَہٗ إِلیٰ کَافَّۃِ النَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا وَ دَاعِیًا إِلیٰ اللّٰہِ بِإِذۡنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیۡرًا صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیۡہِ وَ عَلیٰ اٰلِہٖ وَ أَصۡحَابِہٖ وَ بَارَکَ وَ سَلَّمَ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا۔ أَمَّا بَعۡدُ۔

أعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم. بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم.

تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّ تَبَّ ﴿۱﴾ مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُ مَالُہٗ وَ مَا کَسَبَ ﴿۲﴾ سَیَصۡلٰی نَارًا ذَاتَ لَہَبٍ ﴿۳﴾ وَّ امۡرَاَتُہٗ ؕ حَمَّالَۃَ الۡحَطَبِ ﴿۴﴾ فِیۡ جِیۡدِہَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ ﴿۵﴾

لہب کے معنیٰ:

یہ سورۂ لہب ہے، لہب عربی زبان میں بھڑکتے ہوئے شعلہ کو کہتے ہیں۔ لفظ لہب اس سورت میں دو جگہ آیا ہے، اسی مناسبت سے اس کا نام سورۂ لہب رکھا گیا ہے۔

ترجمہ سورۂ لہب:

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ (ابولہب کے دونوں ہاتھ برباد ہوں، اور وہ خود بھی ہلاک ہو چکا)

[تَبَّ - یَتِبُ تَبّاً و تَبَاباً کے معنیٰ ہیں ہلاک ہونا، برباد ہونا]

مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا کَسَبَ (اس کی دولت اور اس کی کمائی نے اس کو کچھ فائدہ نہیں پہنچایا، کچھ کام نہیں دیا)

سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (وہ بھڑکتے ہوئے شعلوں والی آگ میں داخل ہوگا)

وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (اور اس کی بیوی بھی (اسی بھڑکتے ہوئے شعلوں والی آگ میں داخل ہوگی) ایسی حالت میں کہ وہ لکڑیاں اٹھائے ہوئے ہوگی)

فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (اس کی گردن میں کھجور کی چھال کی رسی یا مضبوط بٹی ہوئی رسی ہوگی)

شانِ نزول:

دراصل اس سورت کے شان نزول کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو اسلام، توحید ورسالت کی دعوت کا حکم ملا۔ قرآن پاک کی آیت کریمہ وانذر عشیرتک الاقربین و رهطک منهم المخلصین (آپ اپنے قریبی رشتہ داروں اور خاص طور پر اپنی جماعت، اپنے کنبہ کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے) نازل ہوئی۔ و رهطک منهم المخلصین پہلے تھی، بعد میں اس کی تلاوت منسوخ ہوئی؛ البتہ مفہوم اب بھی باقی ہے۔ چناں چہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوہِ صفا پر تشریف

لے گئے (اُس وقت مستقل پہاڑی ہی کی طرح تھی، آج کل تو وہ دو دیواروں کے درمیان محصور ہے) اور وہاں جا کر آپ ﷺ نے آواز لگائی یا صباحاہ! عربوں میں آپس میں بڑی عداوتیں ہوا کرتی تھیں، اور ایک قبیلہ اچانک رات کے اندھیرے میں کسی پر حملہ کر کے اس کو نقصان پہنچاتا تھا، قتل و غارت گری ہوا کرتی تھی۔ کب کس پر چڑھ آئے؟ اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جا سکتی تھی۔ ایسے موقع پر جب کسی قبیلہ کے کسی فرد کو یہ معلوم ہوتا کہ میرے قبیلے کے خلاف دشمن قبیلہ چڑھائی کر کے آرہا ہے تو -اس زمانے میں ٹیلیفون یا آج کل آگاہ کرنے کے لیے اور خبر دینے کے لیے جو آلات ہوتے ہیں وہ تو تھے نہیں- وہ آدمی اپنے قبیلہ کو خبر کرنے، آگاہ کرنے، اس کا مقابلہ کرنے اور اس کا جواب دینے کے واسطے بلند جگہ پر چڑھ جاتا تھا اور آواز لگاتا تھا یا صباحاہ! اس کی آواز کو سن کر لوگ جمع ہو جاتے تھے، اور پھر اس شخص کو جو خبر دینی ہوتی، وہ دیا کرتا تھا۔

یا صباحاہ:

نبی کریم ﷺ پر جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (اے نبی! آپ اپنے قریبی خاندان والوں، رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے) کہ اگر وہ ایمان نہیں لائے، اپنے کفر و شرک سے توبہ نہیں کی، اللہ تعالیٰ کی توحید اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کا اقرار نہیں کیا، تو اللہ تعالیٰ کا سخت عذاب ان کو پہنچے گا۔ آپ ان کو بتلائیے۔ چناں چہ آیت کے نزول کے بعد نبی کریم ﷺ نے اپنے خاندان والوں کو جمع کرنے کے لیے اسی طرح کوہ صفا پر چڑھ کر آواز لگائی یا صباحاہ! اور پھر عمومی اور خصوصی انداز میں سب کو پکارا۔ عمومی انداز میں، جیسے: یا بنی ہاشم! یا بنی عبد المطلب! یا بنی

فھر! یا بنی لؤی! یا بنی عبد مناف! اس طرح خاندانوں کا نام لے لے کر پکارا۔ اور اسی طرح قریش کے دیگر قبائل کو بھی نام لے کر پکارا۔ اور پھر افراد کے بھی نام لیے۔ یا عباس بن عبد المطلب! یا حمزۃ بن عبد المطلب! یا صفیۃ بنت عبد المطلب! اپنی پھوپھی اور اپنی صاحب زادی حضرت فاطمہؓ کا نام لیا۔ اور خصوصی، انفرادی، شخصی اعتبار سے بھی خطاب کیا۔ چناں چہ لوگ جمع ہو گئے۔ اس زمانہ کے دستور کے مطابق اگر کوئی شخص کسی وجہ سے خود حاضر نہ ہو سکتا، تو حالات معلوم کرنے کے لیے وہ اپنا نمائندہ بھیج دیتا تھا، چناں چہ سب لوگ جمع ہو گئے۔ جو لوگ آپ کے سامنے کھڑے تھے ان کو یہ نہیں معلوم کہ آپ ﷺ جس پہاڑی (صفا) پر کھڑے ہیں، اس کے پیچھے کیا ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے ان سے سوال کیا کہ بتلاؤ! اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑی کے دامن میں، پیچھے ایک لشکر ہے جو صبح یا شام تم پر حملہ کرنے والا ہے، تو کیا تم میری بات کو مانو گے؟ اس کو سچا سمجھو گے؟ تو لوگوں نے جواب میں کہا کہ ہاں! آج تک ہم نے کبھی آپ پر جھوٹ کا تجربہ نہیں کیا، یا آپ کو کبھی جھوٹا نہیں پایا۔ لہٰذا اگر آپ ایسی بات کہیں گے، تو ہم مان لیں گے۔ ان سے یہ اقرار کرانے کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں تم کو اللہ کے سخت عذاب سے ڈراتا ہوں۔ آپ کا اللہ کے سخت عذاب سے ڈرانے کا مطلب یہ تھا کہ تم جس کفر و شرک میں مبتلا ہو، اپنے آپ کو اس سے نکالو، توبہ کرو اور توحید و رسالت کا اقرار کرو۔ اگر کفر اور شرک نہیں چھوڑو گے، تو اللہ کا سخت عذاب تم پر آئے گا۔ آپ ﷺ نے یہ بات فرمائی۔

ابولہب کون تھا......؟؟؟

اس مجمع میں آپ ﷺ کا چچا ابولہب بھی تھا۔ (نبی کریم ﷺ کے دادا عبد المطلب کے

گیارہ (۱۱) بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک حضرت عبداللہ تھے، جو نبی کریم ﷺ کے والد بزرگوار ہوتے ہیں۔ اور بقیہ دس آپ ﷺ کے چچا تھے۔ ان میں سے ایک کا نام عبدالعزیٰ تھا۔ عزیٰ یہ اس بت کا نام ہے جس کی وہ لوگ پوجا کیا کرتے تھے، اسی کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس کا نام عبدالعزیٰ رکھا گیا تھا۔ جیسے اللہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے عبداللہ، عبدالرحمٰن نام رکھتے ہیں۔ اور اس کی کنیت اور لقب ابولہب تھا) **لہب بھڑکتے ہوئے شعلہ کو کہتے ہیں۔ وہ بڑا حسین و جمیل تھا، اس کا چہرہ ایک دم سرخ و سفید تھا، سفیدی میں ایسی سرخی تھی جیسا کہ شعلہ بھڑک رہا ہو۔ اسی خوب صورتی کی وجہ سے اس کو ابولہب کا یہ لقب اور کنیت دی گئی تھی، اور اسی نام سے وہ مشہور تھا۔** وہ بڑا مالدار بھی تھا۔ قریش اور مکہ مکرمہ کے بڑے مالداروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس کی بیوی کا نام اَرویٰ تھا۔ اس کی کنیت ام جمیل تھی، وہ ابوسفیان کی بہن ہوتی ہے۔

ہر مؤمن کی دلی خواہش:

بہرحال! **جس وقت آپ ﷺ نے اس بات (توحید و رسالت) کی دعوت پیش فرمائی، تو اس مجمع میں ابولہب بھی موجود تھا۔ یہ سن کر وہ بول پڑا: تبا لک سائر الیوم ألهذا جمعتنا؟ یا ألهذا دعوتنا؟ (تمہارے لیے ہمیشہ ہلاکت اور بربادی ہو، کیا اس کام کے لیے ہم کو یہاں بلایا تھا؟ اور جمع کیا تھا؟) اس نے تبا لک سے بددعائیہ جملہ کہا۔ اتنا ہی نہیں اس نے پتھر لے کر نبی کریم ﷺ کو مارا، اور اس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کی ایڑی مبارک زخمی ہو کر خون آلود ہوئی۔** جب حضور ﷺ کو اس نے یہ جملہ کہا، تو اس موقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ سورت نازل ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اگر حضور ﷺ کو کوئی بددعا دے، تو ہر مؤمن کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کے جواب میں ہم اس کو بددعا دیں، گویا ہر مؤمن

کی اسی دلی خواہش کو پورا کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ (۱)

جس کی ابتدا ہی بد دعائیہ جملہ تبت یدا أبی لهب (ابولہب کے دونوں ہاتھ برباد ہوں) سے ہوتی ہے۔ اس نے نعوذ باللہ نبیٔ کریم ﷺ کو بد دعا دی تھی، گویا ہر مؤمن اس سورت کو پڑھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتا ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے موقع فراہم کیا گیا۔ اور آگے ہے وتبّ صرف بد دعا کی حد تک نہیں؛ بلکہ بد دعا وجود میں آ گئی، اور وہ ہلاک ہو گیا۔ جس وقت یہ سورت نازل ہوئی اس وقت تو ہلاک نہیں ہوا تھا؛ لیکن آئندہ اس کی ہونے والی ہلاکت اتنی یقینی اور پکی تھی کہ اس کو لفظ تبّ کے ذریعہ ادا کیا گیا کہ ہلاک ہو گیا۔ چناں چہ اس کے مطابق وہ بعد میں ہلاک ہوا۔

ابولہب حضور ﷺ کے پیچھے پیچھے:

وہ نبیٔ کریم ﷺ کو بہت تکلیفیں پہنچاتا تھا۔ روایات میں وارد ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ لوگوں کو جب اسلام کی دعوت دینے کے لیے جاتے تھے تو یوں کہتے: یا أیها الناس! قولوا لا إله إلا الله تفلحوا. حضرت طارق بن عبداللہ محاربی رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں، فرماتے ہیں کہ میں نے ذوالمجاز کے بازار میں ایک شخص کو دیکھا اس حال میں کہ اس کے جسم پر سرخ جوڑا تھا -حرم کے علاقہ میں موسمِ حج میں مختلف مقامات پر، مختلف دنوں میں میلے لگتے تھے۔ ایک سوق عکاظ تھا، وہاں کچھ دن میلہ لگتا، پھر وہ میلہ اٹھ کر آگے ذوالمجاز میں آتا تھا، کچھ دن وہاں رہنے کے بعد وہ میلہ پھر ذوالمجنۃ میں آتا تھا، پھر وہاں سے آخر میں منیٰ میں آتا تھا، اور منیٰ

---

(۱) أخرجه البخاري برقم: ۴۷۷۰ و ۴۹۷۱ و ۴۹۷۲ و ۴۹۷۳ ومسلم برقم: ۲۰۸ و الترمذي برقم: ۳۳۶۳.

میں وہ میلہ ختم ہوجاتا تھا۔منیٰ بازار کی اصطلاح اسی سے قائم ہوئی ہے۔حج کے موقع پر تمام لوگ عرب کے قبائل سے آیا کرتے تھے،اس موقع پر نبیٔ کریم ﷺ آنے والوں کو دعوتِ اسلام پیش کرنے کے لیے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس میلے میں تشریف لے جاتے تھے۔ میلے میں خرید وفروخت ہوتی تھی، آنے والے لوگ مال لے کر آتے تھے، فروخت کرتے تھے اور اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتے تھے، کچھ شعر وشاعری بھی ہوتی تھی۔وقت گزاری کے لیے شعر وشاعری کے مقابلے بھی ہوتے تھے۔تو حضور اکرم ﷺ ان آنے والوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کرتے تھے-تو حضرت طارق فرماتے ہیں: میں نے ذوالمجاز کے بازار میں ایک شخص کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو کہہ رہا ہے: قولوا لا إلٰه إلا الله تفلحوا.(اے لوگو! لا إله إلا الله کہو، کامیاب ہوجاؤ گے)تو ان کے پیچھے پیچھے ایک آدمی چلتا تھا اور کہتا تھا کہ-نعوذ باللہ- یہ جھوٹا ہے، پاگل ہے، اس کی بات کی طرف دھیان مت دو، اور وہ پتھر بھی مارتا تھا۔ <u>یہاں تک کہ اس نے اس دعوت دینے والے کے ٹخنوں اور ایڑی کے اوپر کے پٹھوں کو لہولہان کر دیا تھا۔انہوں نے معلوم کیا، تو پتہ چلا کہ یہ دعوت دینے والے آپ ﷺ ہیں اور پتھر مارنے والا نبیٔ کریم ﷺ کا چچا ابولہب ہے، جو آپ ﷺ کے ساتھ اس طرح گستاخی کررہا ہے۔</u> اس کی عادت تھی کہ جہاں جہاں حضور ﷺ لوگوں کو اسلام کی دعوت پیش کرنے کے لیے مجمعوں میں جاتے تھے، تو یہ پیچھے پیچھے جا کر اس طرح کہتا تھا کہ اس کی بات کو مت سنو-نعوذ باللہ- یہ جھوٹے ہیں، پاگل ہیں، اور پھر پتھر بھی مارتا تھا۔ یہ اس کی حرکت تھی۔ (۱)

---

(۱)صحيح ابن خزيمة ۱/ ۸۲[۱۵۹] (ط: دار المكتب الإسلامي، بيروت)

ابولہب کی بیوی کا مشغلہ:

اس کی بیوی ام جمیل بھی اس برائی میں اس کا ساتھ دیا کرتی تھی۔ اس کی عادت یہ تھی کی وہ ببول کی لکڑیاں کاٹ کر لاتی تھی، جس میں کانٹے ہوا کرتے تھے۔ اور رات کو جہاں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گزرنے کا راستہ ہوتا تھا، وہاں بچھا دیا کرتی تھی، تاکہ صبح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ کانٹے چبھیں۔ اسی پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ سورت سنادی گئی۔ (۱)

مال، دولت اور اولاد:

اس سے بعض لوگوں نے کہا کہ **محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کہہ رہے ہیں، اس کے مطابق اگر سچ میں عذاب آیا تو تجھے کون بچا پائے گا؟ چوں کہ وہ بڑا مالدار تھا تو کہا کرتا تھا کہ میں اپنے مال کے ذریعہ سے اپنے آپ کو اس عذاب سے چھڑالوں گا۔** اسی پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا: مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ (کچھ کام نہیں آیا اس کا مال و دولت اور جو اس نے کمائی کی تھی) (۲) یہاں کمائی اور دولت کو الگ الگ ذکر کیا، حالاں کہ دولت خود کی کمائی ہی سے ہوتی ہے۔ تو اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ مال تو آدمی کو کبھی بغیر کمائے ہوئے وراثت میں بھی ملتا ہے، لوگ ہدیہ میں بھی دیتے ہیں؛ جب کہ کمائی وہ ہے جو آدمی نے اپنے زورِ بازو سے حاصل کی۔ اسی مال کو جب کاروبار میں لگائے گا اور اس سے جو نفع کمائے گا اس کو کمائی سے تعبیر کریں گے۔ اور بعض نے کمائی کا مصداق اس کی اولاد کو بھی بتلایا ہے۔ (۳)

---

(۱) تفسير الطبري وبحر العلوم للسمرقندي ۱/ ۲۳۲.

(۲) تفسير البغوي ۵/ ۳۲۷ (ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت).

(۳) تفسير عبد الرزاق الصنعاني و تفسير الطبري سورة اللهب.

جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے: نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: تمہاری اولاد تمہاری کمائی میں سے ہے۔[۱] تو اس سے بعض نے اولاد مراد لی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کی دولت، اس کی اولاد اس کے کسی کام نہیں آئی، اللہ کے عذاب سے اس کو بچا نہیں سکی۔

حمالۃ الحطب سے کیا مراد ہے......؟؟؟

حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (اس کی بیوی لکڑیاں اٹھانے والی ہے) لکڑیاں کون سی؟

(۱) ایک مطلب تو وہی ہے جو ابھی گزرا کہ وہ ببول کی کانٹے دار لکڑیاں لاتی تھی اور رات کو نبیٔ کریم ﷺ کے راستے میں بچھایا کرتی تھی۔ اس لیے اس کو حمالة الحطب سے تعبیر کیا ہے۔[۲]

(۲) بعض نے لکڑیوں سے جلانے کی لکڑیاں، سوختہ۔ جس کو گجراتی میں બળતણ کہتے ہیں۔ مراد لی ہیں۔ اس کا گھرانہ مالدار ہونے کے باوجود؛ یہاں اس کے غایت بخل کو بتلانا مقصود ہے کہ مالدار گھرانہ ہونے کی وجہ سے یہ جلانے کی لکڑیاں تو وہ آسانی سے خرید سکتے تھے؛ لیکن وہ اتنی بخیل اور خسیس طبیعت کی تھی کہ جلانے کی لکڑیاں خریدنے کے بجائے خود لینے جاتی تھی۔[۳]

(۳) بعض حضرات حمالة الحطب کا فارسی میں ''ہیزم کش'' ترجمہ کرتے ہیں، اور ''ہیزم کش'' فارسی میں چغلی کرنے والے کو کہتے ہیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے: تیل ڈالتا ہے، پیٹرول ڈالنے کا کام کرتا ہے، یعنی آپس میں لڑانے کا کام کرنا۔ چناں چہ لکڑیاں بول کر چغلی

---

(۱) أخرجه الترمذي برقم: ۱۳۵۸.

(۲) تفسير الطبري وبحر العلوم للسمرقندي: سورة اللهب.

(۳) تفسير عبدالرزاق الصنعاني وتفسير الطبري. سورة اللهب.

مراد لی گئی ہے۔ چوں کہ وہ حضور ﷺ اور صحابہ ؓ کی چغلیاں تکلیف پہنچانے والے دشمنوں کے سامنے کرتی تھی، اور آپس میں لڑاتی بھڑاتی تھی۔ (۱)

(۴) چوتھا مطلب یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ جب یہ جہنم میں داخل ہوگی، تو وہاں بھی جس آگ میں اس کا شوہر جل رہا ہے، اس میں لکڑیاں ڈالے گی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سے بطور عذاب یہی کام کروایا جائے گا۔ (۲)

ام جمیل کی موت:

فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (اس کی گردن میں کھجور کی چھال کی مضبوط بٹی ہوئی رسی ہے) **مسد** بٹ کر مضبوطی کے ساتھ بنائی جانے والی کھجور کی رسی کو کہا جاتا ہے۔ جب وہ لکڑیاں لے کر آتی تھی، تو اسی رسی سے لکڑیوں کو باندھتی تھی، اور لکڑیاں باندھ کر اپنی پیشانی پر جیسے بوجھ اٹھانے والے مزدور بوجھ کی رسی کا آگے والا حصہ پیشانی پر لپیٹتے ہیں اس طرح اٹھا کر آتی تھی۔ اور یہی اس کا طریقہ تھا۔ **ایک مرتبہ تھک گئی اور ایک پتھر پر بیٹھی تو اس کی وہ رسی پیشانی سے نیچے آگئی اور اسی میں اس کی گردن الجھ گئی اور اس کو پھندا لگ گیا اور اسی میں اس کی موت واقع ہوگئی۔** (۲)

حضور ﷺ کی بیٹیوں کو طلاق:

ابولہب حضور ﷺ کا چچا ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کے والد حضرت عبد اللہ کا علاتی بھائی ہے، یعنی ماں دونوں کی الگ الگ تھیں، باپ ایک تھے۔ جب یہ سورت نازل ہوئی تو اس

---

(۱) تفسير الطبري: سورة اللهب.

(۲) تفسير البغوي: ۳۲۷/۵ (ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت) وتفسير ابن كثير: سورة اللهب.

(۲) تفسير الطبري: سورة اللهب.

وقت حضور ﷺ کی چار صاحب زادیاں تھیں: (۱) حضرت زینب ؓ (بڑی صاحب زادی) ان کا نکاح نبیٔ کریم ﷺ نے نبوت سے سرفراز ہونے سے قبل ابو العاص بن ربیع، جو حضرت زینب ؓ کے خالہ زاد بھائی ہوتے ہیں، حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کی بہن کے بیٹے یعنی بھانجے کے ساتھ کروایا تھا۔ دوسری دو صاحب زادیوں (۲) رقیہ ؓ (۳) ام کلثوم ؓ، کا نکاح بھی نبوت ملنے سے پہلے ابولہب کے دو بیٹوں (۱) عتبہ اور (۲) عتیبہ سے کرایا تھا۔ ابھی رخصتی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اور آپ ﷺ پر وحی نازل ہونے کا سلسلہ شروع ہوا، اور آپ ﷺ نے دعوت اسلام دینا شروع کیا، تو ابولہب نے مخالفت کی اور اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ چناں چہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو ابولہب نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم ان کی بیٹیوں کو طلاق دے دو، ورنہ میرے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ چناں چہ ان دونوں لڑکوں نے نبیٔ کریم ﷺ کی صاحب زادیوں کو طلاق دی۔[1] بڑے لڑکے نے صرف طلاق دینے پر ہی اکتفا کیا، اور کوئی گستاخی والا معاملہ نہیں کیا۔ چھوٹے نے تو برا بھلا بھی کہا، حضور ﷺ کے چہرۂ انور پر تھوکا اور آپ ﷺ کی صاحب زادی ام کلثوم ؓ کو طلاق دی۔ جب اس نے نبیٔ کریم ﷺ کے ساتھ گستاخانہ سلوک کیا، تو حضور ﷺ نے اس موقع پر بددعائیہ جملہ ارشاد فرمایا تھا: اللهم سلط عليه كلباً من كلابك. (اے اللہ! تیرے درندوں میں ایک درندے کو تو اس پر مسلط کر دے) ابو طالب بھی موجود تھے، جب انہوں نے یہ بددعا

---

(۱) تاريخ الطبري: ۲/ ۴۶۷-۴۶۸ (ط: دار التراث، بيروت) والسيرة النبوية وأخبار الخلفاء لابن حبان: ۱/ ۷۱ (ط: دار الكتب الثقافية، بيروت) والاستيعاب في معرفة الأصحاب لابن عبد البر: ۴/ ۱۸۳۹- ۱۸۴۱ و ۴/ ۱۹۵۲- ۱۹۵۳ (ط: دار الجيل، بيروت)

سنی، تو ابو طالب نے اس سے کہا کہ اب تم ان کی بد دعا سے نجات نہیں پا سکتے ہو۔ خود ابولہب بھی جانتا تھا کہ اب ان کی بد دعا تو اپنا رنگ اور اثر دکھائے گی۔ چناں چہ یہ باپ بیٹے ڈرے سہمے رہتے تھے کہ پتہ نہیں کب اس بد دعا کا اثر ظاہر ہو؟

ان سے زیادہ سچا کوئی نہیں:

ایک مرتبہ شام کے علاقہ میں ایک سفر میں ابولہب اپنے اسی بیٹے کو قافلہ میں لے کر جا رہا تھا، ایک جگہ پر قیام ہوا تو ابولہب نے کہا: ان کی بد دعا کی وجہ سے ہم کو ڈر ہے، کہیں کوئی آ کر میرے بیٹے کو پھاڑ نہ کھائے، اس لیے تم ہمارا لحاظ کرتے ہوئے اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست کرو۔ **چناں چہ قافلہ والوں نے سب کے سامان کا ڈھیر لگایا اور اس کے اوپر ابولہب کے بیٹے کو لٹایا، اور سامان کے ڈھیر کے چاروں طرف قافلہ والے لیٹ گئے۔ رات کو شیر آیا اور اس نے سب کو سونگھا، اس کے بعد چھلانگ لگا کر اوپر گیا اور اس کا سر بدن سے الگ کر دیا۔** بعض روایتوں میں ہے کہ رات کو ابھی سونے کی نوبت نہیں آئی تھی، اسی وقت شیر نے باہر سے آواز لگائی، دہاڑا، تو اس کے گرجنے کی آواز سن کر یہ کانپنے لگا، لوگوں نے کہا: ہم نے بھی آواز سنی جیسے تو نے سنی۔ تجھ پر اتنا زیادہ اثر کیوں ہے؟ تو اس نے کہا کہ مجھ کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بد دعا کے جملے یاد آ رہے ہیں، اس روئے زمین پر، آسمان کے نیچے ان سے زیادہ سچا کوئی نہیں ہے۔ کھانے کا وقت آیا تو ڈر اور خوف کی وجہ سے اس کا ہاتھ آگے نہیں جا رہا تھا۔ اور رات کو یہی واقعہ پیش آیا کہ شیر نے آ کر اس کو ختم کر دیا۔ حالاں کہ ان دونوں کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کا یقین تھا اس کے باوجود ایمان نہیں لائے۔ (۱)

---

(۱) دلائل النبوة لأبي نعيم الأصبهاني: ۱/ ۴۵۴-۴۵۸ (ط: دار النفائس، بیروت) و دلائل النبوة لقوام السنة الأصبهاني: ۱/ ۷۰-۷۱ (ط: دار طيبة، الرياض).

تین ہجرتیں:

اس کے بعد حضور ﷺ نے حضرت رقیہؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کیا اور وہ ان کے نکاح میں تھیں، اسی زمانے میں ان دونوں میاں بیوی حضرت عثمانؓ اور حضرت رقیہؓ نے حبشہ کی جانب ہجرت کی۔ ایک مرتبہ گئے، پھر وہاں افواہ پھیلی کہ مکہ والے سب مسلمان ہو گئے اور اب وہ مسلمانوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچاتے ہیں اس لیے اس افواہ کو سن کر بہت سے لوگ مکہ واپس آ گئے، یہاں آئے تو معلوم ہوا کہ سلسلہ جوں کا توں باقی ہے۔ پھر دوبارہ مکہ ہی سے حبشہ کی ہجرت کی، اور پھر حبشہ سے مدینہ کی بھی ہجرت کی۔ گویا تین ہجرتیں کیں، حبشہ کی دو، اور مدینہ کی ایک۔

ذوالنورین:

جب حضور ﷺ غزوۂ بدر کے لیے نکلے، اس وقت حضرت رقیہؓ بیمار تھیں، حضرت عثمانؓ بھی نکلنا چاہتے تھے؛ لیکن حضرت رقیہؓ کی تیمارداری کے لیے حضور ﷺ نے ان کو روک دیا کہ آپ مت آیئے، ان کی تیمارداری میں رہو۔ اُدھر اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو کامیابی عطا فرمائی، اور جب حضرت زید بن حارثہؓ بشارت دینے کے لیے مدینہ پہنچے، تو انہوں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کی صاحب زادی حضرت رقیہؓ کو دفن کیا جا رہا ہے۔[۱]

حضرت رقیہؓ کے انتقال کے بعد حضور ﷺ نے اپنی دوسری صاحب زادی حضرت ام کلثومؓ کو بھی حضرت عثمانؓ کے نکاح میں دیا۔ اور فرمایا کہ پہلی بیٹی کو بھی اللہ کے حکم سے ہی ان کے

---

(۱) الاستیعاب في معرفة الأصحاب: ۱۸۴۱/۴ (ط: دار الجیل، بیروت).

نکاح میں دیا تھا اور دوسری بیٹی کو بھی اللہ ہی کے حکم سے دیا ہے۔ پھر ۸ / ۹ھ میں حضرت ام کلثوم ؓ کا انتقال ہوا، اس موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا: اگر میری تیسری بیٹی بغیر نکاح کے ہوتی تو اس کو بھی ان کے نکاح میں دیتا۔ [1] حضور ﷺ کی دو بیٹیاں حضرت عثمان ؓ کے نکاح میں تھیں، اس لیے حضرت عثمان ؓ کو ذوالنورین کہتے ہیں۔ گویا حضور ﷺ کی ہر صاحب زادی ایک نور ہے، تو حضرت عثمان ؓ دو نور والے ہوئے۔ یہ حضرت عثمان ؓ کی خصوصیت ہے۔ آخری صاحب زادی حضرت فاطمہ ؓ کو تو حضور ﷺ نے حضرت علی ؓ کے نکاح میں دیا تھا۔ اس طرح ابولہب کے کہنے سے بیٹوں نے حضور ﷺ کی صاحب زادیوں کو طلاق دی۔

ابولہب کا عبرت ناک انجام:

حضور ﷺ اور مسلمان ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے، ۲ھ میں غزوۂ بدر پیش آیا۔ ابولہب کو بھی اس میں شریک ہونا تھا؛ مگر مارے ڈر کے شریک نہیں ہوا، اور اپنی جگہ ابوجہل کے بھائی کو رقم دے کر بھیجا۔ ادھر غزوۂ بدر ختم ہوا، اس کے بعد چند ہی دنوں میں اس کو چیچک کی بیماری لگ گئی۔ عربوں میں وہم پرستی تھی، جس کی وجہ سے وہ یوں سمجھتے تھے کہ چیچک کی بیماری والے شخص کے پاس جو کوئی جاتا ہے اس کو بھی چیچک کی بیماری لگ جاتی ہے۔ اس لیے اس کو بھی جب یہ بیماری لگی تو گھر والوں نے اپنے رہائشی گھر سے اس کو دوسرے گھر میں ڈال دیا۔ اور وہاں کوئی نہیں جاتا تھا، چند دنوں میں پورے جسم پر وہ بیماری

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۷/ ۱۸۴ (ط: مکتبۃ ابن تیمیۃ، القاہرۃ) وتاریخ دمشق لابن عساکر: ۳۹/ ۴۴-۴۷ (ط: دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع)

پھیل گئی، اسی میں اس کی موت واقع ہوگئی۔ مرنے کے بعد اس کی لاش اسی مکان میں ویسی ہی پڑی رہی، بدبو آنے لگی تو لوگوں نے اس کے بیٹوں کو عار دلائی کہ تمہارا باپ مر گیا تو بھی خبر نہیں لیتے؟ انہوں نے ایک حبشی غلام کو پیسے دے کر تیار کیا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ اس نے ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اس کی لاش کو بٹھا دیا، پھر سب نے دور ہی سے اس کو پتھر مارے، اتنے پتھر مارے کہ وہ اسی میں دفن ہوگیا۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک گڑھا کھودا گیا اور لکڑی کے ذریعہ سے اس کی لاش کو اندر ڈالا گیا اور اوپر پتھر ڈال کر اس کو اسی طرح دفن کیا گیا۔ اس طرح ذلت اور رسوائی کے ساتھ اس کی موت آئی۔ (۱)

وہ مجھے نہیں دیکھ سکے گی:

حضور ﷺ مکہ میں تھے اور یہ سورت نازل ہوئی تھی، جب یہ سورت نازل ہوئی تو ابولہب کی بیوی ام جمیل کو پتہ چلا کہ ایسی سورت نازل ہوئی ہے، تو وہ حضور ﷺ کو بہت برا بھلا کہتی تھی، گالیاں دیتی تھی۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ ایسی سورت نازل ہوئی تو وہ آپ ﷺ کے پاس گالیاں دیتی ہوئی پتھر لے کر آئی، آپ ﷺ حرم میں بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابوبکرؓ بھی پاس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! وہ گالیاں دیتے ہوئے اور پتھر لیے ہوئے آرہی ہے۔ آپ کو مارے گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: گھبراؤ مت! وہ مجھے نہیں دیکھ سکے گی۔ چناں چہ جب وہ قریب آئی تو حضرت ابوبکرؓ سے پوچھتی ہے: تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟ حالاں کہ حضور ﷺ وہیں موجود تھے۔ انہوں نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں!!! اور کہا اگر میں ان کو پالوں گی، تو یہ پتھر ان کے منہ پر

(۱) المعجم الكبير للطبراني: ۱/۳۰۸ [۹۱۲].

ماروں گی، اور کہا: سن لو! میں شاعرہ ہوں۔ (۱)

میں مذمم نہیں، محمد ہوں:

اور اس نے یہ اشعار کہے۔۔۔۔۔۔۔

مُذَمَّمًا عَصَيْنَا وَأمره أَبَيْنَا وَدينه قلينا

ترجمہ: ہم نے مذمم کی نافرمانی کی، اور ہم نے ان کے حکم کو قبول کرنے سے انکار کیا، اور ہم نے ان کے دین سے دشمنی کی۔ وہ یہ شعر پڑھتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

قلیٰ - یقلی اس کے معنیٰ دشمنی کرنا ہیں۔ جیسے قرآن میں ہے: مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ والے بجائے محمد کے-نعوذ باللہ-مُذَمّم کہتے تھے۔ تو وہ بھی یہ بولتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ محمد کا ترجمہ ہوتا ہے قابل تعریف، اور مذمم کا ترجمہ ہوتا ہے قابل مذمت، برائی کیا جانے والا۔ دیکھیے! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے مذمم بولنے پر ناراض نہیں ہوتے تھے؛ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا اکرم ہے کہ ان کی گالیوں کو اللہ تعالیٰ نے یوں ہی میرے اوپر سے ہٹا دیا۔ اس لیے کہ وہ لوگ جب بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برا بھلا کہتے تھے، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام میں محمد نہیں بولتے تھے؛ بلکہ مذمم بولتے تھے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے کہ وہ تو مذمم کو برا بھلا کہتے ہیں، اور میں تو مذمم ہوں نہیں!!! میرا نام تو محمد ہے!!! کتنی آسانی اور سادگی کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو حل کر دیا! !! ذرا بھی برا نہ لگا، اور معاملہ ختم ہو گیا۔ (۲)

---

(۱) سیرة ابن هشام: ۱/۳۵۲ (ط: مطبعة مصطفىٰ البابي الحلبي، مصر)

(۲) سیرة ابن هشام: ۱/۳۵۲ (ط: مطبعة مصطفىٰ البابي الحلبي، مصر)

میں نے اللہ سے ان دونوں کو مانگ لیا ہے:

فتح مکہ کے موقع پر حضور ﷺ نے حضرت عباسؓ سے کہا: تم اپنے بھتیجوں کو میرے پاس نہیں لاتے؟ - ابولہب کا ایک بیٹا عتیبہ تو مارا گیا تھا، دوسرا عتبہ تھا، اور تیسرا معتّب تھا- آپ نے فرمایا: ان کو لے آؤ! حضرت عباسؓ ان کو تلاش کرنے کے لیے نکلے، وہ بھاگ کر عرفات چلے گئے تھے، حضرت عباسؓ ان کو لائے، وہ آئے، اور ایمان قبول کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میں نے اللہ تعالیٰ سے ان دونوں کو مانگ لیا ہے۔ (۱) حضور ﷺ کی شفقت دیکھو! جس آدمی نے آپ ﷺ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا تھا ان کی اولاد کے ساتھ یہ سلوک! حضور ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر لوگوں کو بلا بلا کر ایمان کی دعوت دی۔ حضرت ابوبکرؓ کے والد جن کا نام عثمان تھا، ابو قحافہ کنیت تھی۔ ان کو دعوت دی، تو وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح اور بہت سارے وہ لوگ جو تکلیفیں پہنچاتے تھے، ان کو بلا کر اپنے سامنے بٹھاتے تھے اور دعوتِ اسلام پیش کرتے تھے۔ یہ حضور ﷺ کی رحمت اور شفقت کا معاملہ ہے۔ (۲)

ابولہب کی کنیت کیوں......؟؟؟

ایک سوال یہ ہے کہ ابولہب کی کنیت کیوں لی گئی؟ اس کا نام کیوں نہیں لیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا نام عبد العزیٰ تھا۔ چوں کہ اس میں بت کی طرف نسبت ہوتی

---

(۱) الطبقات الکبری لابن سعد: ۴/۴۴-۴۵ [۳۵۵ و ۳۵۶] (ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت).

(۲) أخرجه ابن حبان في الموارد برقم: ۱۷۰۰ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت) و ابن هشام في سيرته: ۲/ ۴۰۵- ۴۰۶ (ط: مطبعة مصطفىٰ البابي الحلبي) و الحاكم في المستدرك: ۳/ ۴۸ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت) وغيرهم.

تھی، اس لیے اس نام کو قرآن میں ذکر کرنا مناسب نہیں تھا، اس لیے ابولہب کنیت بولا گیا۔
پھر ابولہب میں اس بات کی طرف اشارہ بھی تھا کہ وہ بھڑکنے والی آگ میں داخل ہوگا۔

درسِ عبرت:

اس سورت میں بڑی عبرت بھی ہے۔ایک مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ بھی ہے۔
بہت سے لوگ اپنے مال کے غرور اور گھمنڈ میں حق کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں، اور اللہ کے مقبول بندوں کو ستاتے ہیں۔جیسا کہ ابولہب نے انکار کیا تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ حق ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو اللہ کے مقرب تھے ان کو ستایا۔تو اس میں یہ عبرت ہے کہ مال کی وجہ سے ایسے کام نہیں کرنے چاہیے، مال کسی کام آنے والا نہیں ہے۔
اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق عطا فرمائے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ نصر

(مؤرخہ ۱/ذی قعدۃ ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۵/جولائی ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

(قسط-۱)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ من شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا وَ نَعُوذُ بِاللّٰہِ من شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ أَنْ لَّا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ أَرْسَلَہٗ إِلٰی کَافَّۃِ النَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَ دَاعِیًا إِلَی اللّٰہِ بِإِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ أَصْحَابِہٖ وَ بَارَکَ وَ سَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا. أَمَّا بَعْدُ.

أعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم. بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم.

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ ۙ﴿۱﴾ وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۲﴾ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَ اسۡتَغۡفِرۡہُ ؕؔ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾

ترجمۂ سورت:

یہ سورۂ نصر ہے، تین آیتیں ہیں:

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ (جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے)

وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا (اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ فوج درفوج، گروہ درگروہ اللہ کے دین میں داخل ہورہے ہیں)

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (تو اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کیجیے اور اللہ سے مغفرت چاہیے)

اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (بے شک وہ بہت معاف کرنے والا ہے)

اس سورت کے متعلق سب کا اتفاق ہے کہ قرآن پاک میں سب سے آخر میں مکمل طور پر نازل ہونے والی یہی سورۂ نصر ہے۔ (۱) اس کے بعد کچھ آیتیں اور کچھ سورتوں کے حصے تو نازل ہوئے؛ لیکن مکمل سورت نازل نہیں ہوئی۔

فتح مکہ سے قبل یا اس کے بعد؟

البتہ اس سلسلے میں حضرات مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ یہ سورت مکہ مکرمہ فتح ہونے سے پہلے نازل ہوئی یا فتحِ مکہ کے بعد نازل ہوئی؟

(۱) صاحب روح المعانی نے البحر المحیط سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں بتلایا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب فتح خیبر کے بعد مدینہ منورہ لوٹ رہے تھے، تو راستہ میں یہ نازل ہوئی۔ فتح خیبر ماہ محرم ۷ھ میں ہوئی، اس کے بعد دو سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں قیام پذیر رہے؛ لیکن اس کے علاوہ اور کوئی دوسری سورت مکمل نازل نہیں ہوئی۔ (۲)

(۲) حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت یہ ہے کہ یہ سورت حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے دوران منیٰ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قیام کے وقت نازل ہوئی۔ (۳)

---

(۱) صحيح مسلم: ۳۰۲۴ والسنن الكبرىٰ للنسائي: ۱۰/ ۳۴۹ (ط: مؤسسة الرسالة، لبنان)

(۲) البحر المحيط لأبي حيان الأندلسي وروح المعاني للآلوسي، سورۂ نصر.

(۳) البحر المحيط، سورۂ نصر.

اوراس کے بعد سورۂ بقرہ کی آیت: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا. (المائدۃ:۳) نازل ہوئی ۔ اور ان دونوں یعنی سورۂ نصر اور اس آیت کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ ۸۰ ؍دن دنیا میں رہے۔

اس کے بعد آیت کلالہ نازل ہوئی، اس وقت نبی کریم ﷺ کی عمر شریف کے ۳۵ ؍دن باقی رہ گئے تھے، اور سب سے اخیر میں سورۂ بقرہ کی آیت وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ. (البقرۃ:۲۸۱) نازل ہوئی۔ [(۱)] اس وقت نبی کریم ﷺ کی عمر شریف کے ۲۱ ؍دن اور مقاتل کی روایت کے مطابق صرف ۷ ؍دن باقی رہ گئے تھے۔ بہر حال! فتح مکہ سے پہلے اور فتح مکہ کے بعد، دونوں طرح نازل ہونے کی باتیں ہیں۔

آپ ﷺ کے معمول میں تبدیلی:

یہاں لفظ فتح سے مکہ مکرمہ کی فتح مراد ہے۔ اس پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔

(۱) بخاری شریف میں حضرت عائشہ ؓ کی روایت ہے کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جب بھی کوئی نماز پڑھتے، تو آپ یہ دعا کرتے: سبحانک ربنا وبحمدک اللّٰھم اغفرلی. [(۲)]

(۲) حضرت عائشہ ؓ کی روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ اٹھتے بیٹھتے، جاتے آتے سبحان الله وبحمده أستغفر الله وأتوب إليه. پڑھتے اور یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے، اور دلیل کے طور

---

(۱) أخرجه البخاري برقم: ۴۵۴۴.

(۲) أخرجه البخاري برقم: ۴۹۶۷.

آپ ﷺ سورۂ نصر کی تلاوت فرماتے تھے۔ (۱)

(۳) تفسیر قرطبی میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ عبادات میں بہت زیادہ مجاہدہ فرمانے لگے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے پاؤں پر ورم آگیا۔ (۲)

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَ الۡفَتۡحُ (جب اللہ تعالیٰ کی مدد اور فتح آجائے)

دعوت پر مخالفت واذیت:

یہاں فتح سے فتح مکہ مراد ہے۔ نبی کریم ﷺ کی ولادت شریفہ مکہ مکرمہ میں ہوئی، اور جب آپ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ کے ۴۰ر سال پورے کیے، اس وقت نبی کریم ﷺ پر وحی نازل ہوئی، اور اس کے بعد ایک وقت آیا جب یہ آیت نازل ہوئی: و انذر عشيرتك الاقربين.(الشعراء:۲۱۴)ورهطك منهم المخلصين. اس وقت نبی کریم ﷺ نے قبیلۂ قریش کی شاخوں اور اپنے خاندان کے بعض افراد کو نام لے لے کر کوہِ صفا کے پاس جمع کیا، اور اللہ کے حکم کے مطابق اس کے عذاب سے ڈرایا۔ جیسا کہ سورۂ لہب کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ (قد مر تخريجه ص: ۱۰۶) اس طرح آپ ﷺ لوگوں کو ایمان واسلام کی دعوت دیتے رہے؛ <u>لیکن مکہ والوں نے اس دعوت پر ایمان لانے کے بجائے آپ ﷺ کی مخالفت کی، اور صرف مخالفت ہی نہیں؛ بلکہ آپ ﷺ کو اور آپ پر ایمان لانے والے لوگوں کو بہت تکلیفیں پہنچائیں، اور ظلم وستم کی کوئی شکل ایسی نہیں تھی، جو انھوں نے حضور ﷺ</u>

---

(۱) أخرجه مسلم برقم: ۴۸۴.

(۲) الجامع لأحكام القرآن للقرطبي، سورة نصر.

اور ایمان والوں کے ساتھ اختیار نہ کی ہو۔ سخت گرمی کے زمانے میں، تپتی ہوئی ریت پر ان کولٹا دیا جاتا تھا، اور اوپر پتھر کی سِل رکھ دی جاتی تھی، اسی طرح انگاروں پر لٹایا جاتا تھا۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ کا واقعہ آپ نے حکایاتِ صحابہ میں سنا ہوگا کہ ان کی چربی کے پگھلنے سے انگارے بجھتے تھے۔ ایسی ایسی تکلیفیں پہنچائی گئی تھیں۔ کوئی تکلیف ایسی نہیں تھی جو نہ پہنچائی ہو۔

میری مدد کرو......:

وحی کے نزول کے بعد ۱۳ر سال نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں گزارے؛ لیکن مکہ والوں کی بڑی تعداد وہ تھی جو ایمان نہیں لائی تھی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب ان کی طرف سے مایوسی ہوئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج کے موقع پر آنے والے عرب کے دیگر قبائل کے پاس جا کر ان کو ایمان واسلام کی دعوت دیتے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے یہ درخواست بھی کرتے تھے کہ آپ مجھے اپنے علاقہ میں لے جاؤ، اور مجھے اللہ کے حکم کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا موقع دو، میری مدد کرو؛ لیکن قریش ایک ایسا قبیلہ تھا کہ عرب کے تمام قبائل پر اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی بھی قبیلہ قریش کو اپنا دشمن بنانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ان کو اپنے وہاں لے جائیں گے، تو اس کا مطلب قریش کو اپنا دشمن بنانا ہے، اور ان کی دشمنی مول لینا وہ اپنی طاقت سے باہر سمجھتے تھے۔

......تب ہم تم پر غالب آئیں گے:

لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ وہ یہ خدمت مدینہ منورہ کے دو قبیلوں اوس وخزرج - جن کو بعد میں انصار کا لقب ملا - سے لے۔ چناں چہ نبوت کے گیارہویں سال قبیلۂ خزرج کے ۶ر آدمی آئے، اور حج کے موقع پر منیٰ میں جمرۂ عقبہ کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی

ملاقات ہوئی، آپ ﷺ نے دعوت اسلام پیش کی، انہوں نے قبول کر لی۔ [(۱)] مدینہ منورہ میں یہودیوں کے دو قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر آباد تھے، وہ اہل کتاب تھے اور اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ان کی آسمانی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبیٔ آخر الزمان کی آمد اور ان کی جو علامات بتلائی گئی تھیں وہ سب انہیں معلوم تھیں، اور اوس وخزرج کا رہنا سہنا بھی چوں کہ یہودیوں میں تھا اور ان کی یہودیوں کے ساتھ آپس میں چپقلش اور کشاکشی بھی چلتی رہتی تھی، مقابلے بھی ہوتے رہتے تھے، تو <u>یہودی ان سے کہا کرتے تھے کہ دیکھو! نبیٔ آخر الزمان آنے والے ہیں جب وہ آئیں گے، تو ہم ان پر ایمان لائیں گے۔ اور ان کے ساتھ مل کر ہم تم کو اس طرح قتل کریں گے جیسے قومِ عاد اور قوم ارم کو قتل کیا گیا۔ اور ان پر ایمان لانے سے اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے گا، اور اس وقت ہم تم پر غالب آئیں گے۔</u>

بیعتِ عقبۂ اولیٰ:

البتہ یہودی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ نبیٔ آخر الزمان ہمارے اندر یعنی بنی اسرائیل میں آئیں گے۔ بہر حال! اوس وخزرج یہودیوں سے یہ باتیں سنتے رہتے تھے۔ وہ تو اصل میں بت پرست تھے، ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں تھی، ان کو اس سلسلہ میں کوئی معلومات نہیں تھی۔ تو یہ ۶ / آدمی جب حج کے لیے آئے اور حضور ﷺ سے ملاقات ہوئی، اور آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور میں تم کو ایمان کی دعوت دیتا ہوں، تو انہیں یہودیوں کی باتیں یاد آگئیں۔ اور انہوں نے آپس میں کہا کہ یہودی ہم سے کہا کرتے ہیں کہ نبیٔ آخر الزمان جب آئیں گے، تو ہم ان پر ایمان لائیں گے اور ان پر ایمان لانے کی

---

(۱) سیرۃ ابن ھشام: ۱ / ۴۲۸-۴۳۰۔

وجہ سے اللہ تعالیٰ ہماری مدد کریں گے اور اس کے نتیجہ میں ہم تم پر غالب آئیں گے۔تو وہ ایمان لائیں اس سے پہلے ہم کو موقع ملا ہے، ہم کیوں نہ ایمان لے آئیں؟!!! چناں چہ یہ چھ آدمی ایمان لے آئے۔ اس وقت اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہوئی؛ البتہ انھوں نے کہا کہ آئندہ سال ہم دوبارہ آپ سے ملاقات کریں گے۔ چناں چہ دوسرے سال حج کے موقع پر ٦ کے بجائے ۱۲ر آدمی آئے۔ ان ۱۲ر میں ۵ر تو وہی تھے، جو اگلے سال آئے تھے، باقی ۷ر نئے تھے۔ وہ ایمان لاکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ اس کو بیعتِ عقبۂ اولیٰ کہا جاتا ہے۔ (۱)

بیعتِ عقبۂ ثانیہ:

پھر انھوں نے یہ درخواست کی کہ آپ اپنے تربیت کردہ بعض صحابہؓ کو ہمارے پاس بھیجیے، تاکہ ہم کو وہاں اسلام کے احکام اور قرآن کی تعلیم سے واقف کریں۔ چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو اور پھر حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کو بھیجا۔ یہ دونوں حضرت اسعد بن زرارہؓ کے گھر پر ٹھہرے، اور وہاں رہ کر انھوں نے ایمان واسلام کی دعوت دینا شروع کیا۔ اور پھر تو مدینہ کے عرب قبائل میں گھر گھر میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چرچا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے بعد والے (یعنی نبوت کے ۱۳ رویں) سال ۷۵ر افراد۔ جن میں ۷۳ر مرد اور ۲ر عورتیں تھیں۔ حج کے موقع پر پہنچے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت ہوئی۔ یہ بیعتِ عقبۂ ثانیہ کہلاتی ہے۔ (۲)

---

(۱) سیرۃ ابن ھشام: ۱/ ۴۳۱-۴۳۳.

(۲) سیرۃ ابن ھشام: ۱/ ۴۳۸-۴۴۱.

ہجرت:

اسی موقع پر انھوں نے نبیٔ کریم ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ہمارے ہاں تشریف لے آیئے، ہم جس طرح اپنی جان کی، اپنے اہل وعیال کی حفاظت کرتے ہیں، آپ کی بھی حفاظت کریں گے، اور اس دعوتِ ایمان میں ہم آپ کا پورا پورا ساتھ دیں گے، اورتعاون کریں گے۔ چناں چہ ۱۳ نبوی مکمل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضور ﷺ نے صحابہؓ کو مدینہ منورہ ہجرت کی اجازت دی۔ پہلے کچھ صحابہ وہاں پہنچے، جیسے حضرت عمرؓ وغیرہ۔ یہاں تک کہ ماہ ربیع الاول میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو بھی اجازت دی، اور آپ بھی ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ (۱)

آپسی لڑائی کی ہوگئی صفائی:

مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد مکہ والوں کو اور زیادہ غصہ آیا کہ یہ لوگ تو وہاں چلے گئے!!! وہ تو دین کے دشمن تھے، انھوں نے ان کو مدینہ منورہ میں بھی چین سے رہنے نہیں دیا۔ چناں چہ یہاں رہ کر بھی مدینہ منورہ والوں کو کہلواتے تھے، دھمکیاں دیتے تھے کہ تم نے ان کو پناہ دی ہے، ہم تم پر حملہ کریں گے اور تم سے مقابلہ کریں گے، تم ان کو مدینہ سے نکالو۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان کو آپس میں اندرونی طور پر بھی ابھارنے کی کوشش کی۔ ایمان نہ لانے والوں اور عبد اللہ بن ابی – جو ظاہری ایمان بھی نہیں لایا تھا – کو لڑائی کے لیے آمادہ کیا، یہاں تک کہ ایک موقع پر آپس میں با قاعدہ ٹکراؤ کی صورت بھی پیدا ہوگئی؛ مگر

---

(۱) سیرۃ ابن ھشام: ۱/ ۴۶۸- ۴۹۲.

نبی کریم ﷺ عین وقت پر پہنچ گئے، اور لوگوں کو سمجھایا کہ یہ تو تم کو آپس میں لڑا کر نقصان کرنا چاہتے ہیں۔ اور معاملہ صاف کر دیا۔ جب ان کی طرف سے مایوس ہو گئے، تو انہوں نے (مکہ والوں نے) یہودیوں کو خط لکھا کہ تم قلعوں والے اور ہتھیار والے ہو، ان لوگوں کو تم اپنے وہاں سے نکالو۔ لیکن حضور ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ پہلے ہی امن کا معاہدہ کر لیا تھا۔

حضور ﷺ کا خواب:

بہرحال! مکہ والوں کو چین نہیں پڑا، تو لشکر لے کر بار بار مدینہ پر حملے کیے۔ جنگ بدر ہوئی، جنگ احد ہوئی، جنگ خندق ہوئی، مختلف جنگیں ہوئیں، اور جنگ خندق کے بعد والے سال نبی کریم ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے صحابہ کے سامنے اپنے اس خواب کا تذکرہ کیا۔ (۱) تو جو صحابہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ گئے تھے، ان کو مدینہ میں چھٹا سال چل رہا تھا، ظاہر ہے کہ وہ مکہ میں پیدا ہوئے، زندگی کا بڑا حصہ وہاں گزارا تھا، مکہ کی یاد تو ان کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی، جب یہ خواب سنا تو بے چین ہو گئے۔ اور نبی کا خواب وحی کے حکم میں ہوتا ہے، اس لیے انہوں نے کہا کہ ہم چلیں گے، اور حضور ﷺ بھی تیار ہو گئے۔

صلح حدیبیہ:

بہرحال! تقریباً ڈیڑھ ہزار کا قافلہ عمرہ کے لیے چلا۔ (۲) اور مکہ والوں کو پتہ چلا، تو

---

(۱) تفسير الطبري (سورة الفتح) ونقله الحافظ في الفتح في التعبير عن الفريابي و عبد بن حميد و الطبري عن طريق ابن أبي نجيح عن مجاهد.

(۲) قال ابن اسحاق: وكان جابر بن عبدالله فيمابلغني يقول: كنا أصحاب الحديبية أربع = =

انہوں نے پہلے ہی سے تیاریاں کرلیں ،قریش کے علاوہ مکہ کے آس پاس رہنے والے دوسرے قبائل کوبھی مقابلہ کے لیے اپنا ہم خیال بنالیا،اور طے کرلیا کہ کسی بھی حال میں ان کو مسجد حرام میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔اگر یہ داخل ہوگئے تو ہماری ناک کٹ جائے گی۔ **چناں چہ حضور ﷺ کو جب ان حالات کا علم ہوا،تو آپ ﷺ سیدھے جانے کے بجائے راستہ بدل کر آگے بڑھے۔چناں چہ مقام حدیبیہ میں آپ ﷺ کی اونٹنی اللہ کے حکم سے بیٹھ گئی،اٹھانا چاہا تو اٹھی،دوبارہ بیٹھ گئی اور پھر نہ اٹھی۔**(۱)حضور ﷺ کو وحی کے ذریعہ مکمل بات بتلادی گئی کہ اس وقت آپ کو مکہ جانے کا موقع نہیں ملے گا،اور اس بات سے بھی آگاہ کیا گیا کہ اگر آپسی صلح کی کوئی صورت نکل آئے،تو آپ اس کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ چناں چہ آخر میں دس سال کے لیے صلح ہوئی،اور آپ ﷺ مکہ مکرمہ سے بغیر عمرہ کیے لوٹے۔اس صلح کی شرائط میں پہلی شرط یہ تھی کہ اس سال تو یہ لوگ بغیر عمرہ کے واپس جائیں گے؛ البتہ آئندہ سال ان ہی دنوں میں دوبارہ آئیں گے اور عمرہ کریں گے۔دیگر شرائط بھی تھیں، جیسے:دس سال تک ہم باہم جنگ نہیں کریں گے،اور ہماری صلح میں جو دوسرے قبائل شریک ہونا چاہیں،تو وہ شریک ہوسکتے ہیں۔(۲)

خدا کی قسم! یہ فتح ہے:

چناں چہ جب صلح مکمل ہوگئی،تو صلح کے مطابق نبیٔ کریم ﷺ عمرہ کیے بغیر حدیبیہ

=عشرة مائة، السيرة النبوية لابن اسحاق ص: ۴۵۴(ط: دار الكتب العلمية ، بيروت) و صحيح البخاري: ۴۸۴.

(۱)السيرة النبوية لابن إسحاق ص:۴۵۵ و صحيح البخاري: ۲۷۳۱ و ۲۷۳۲.

(۲)السيرة النبوية لابن إسحاق ص:۴۶۱-۴۶۲.

سے واپس لوٹے۔ جب واپس لوٹ رہے تھے، تو سورۂ فتح کی شروع کی آیتیں: اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا ۙ﴿۱﴾ لِّيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ يُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكَ وَ يَهۡدِيَكَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا.(سورۃ الفتح :۱-۲) نازل ہوئیں۔ **جب یہ آیتیں نازل ہوئیں تو حضور اکرم ﷺ نے حضرات صحابہ سے فرمایا کہ آج ایسی عجیب وغریب سورت نازل ہوئی جو میرے نزدیک دونوں جہاں سے زیادہ قیمتی اور محبوب ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیتیں پڑھ کر سنائیں۔** [۱] **اس سورت میں صلح کا جو واقعہ پیش آیا تھا، اس کو اللہ تعالیٰ نے فتح سے تعبیر کیا ہے، تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ فتح ہے؟ یہ تو ہم نے بہت دب کر صلح کی ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! یہ فتح ہے۔** [۲] چناں چہ بعد کے حالات نے بتلایا کہ واقعۃً یہ فتح مبین ہے۔ خیر! صلح کے بعد امن وسکون ہوگیا، ان کے حملے نہیں ہوئے۔ اس کے بعد دوسرے سال شرط کے مطابق ۷ھ میں حضور ﷺ صحابہؓ کے ساتھ عمرہ کے لیے تشریف لے گئے، اور عمرہ سے فارغ ہوئے۔

عہد شکنی:

مکہ والوں کا تو شرائط پر باقی رہنا مشکل تھا۔ مکہ مکرمہ کے قرب وجوار میں دو قبیلے رہتے تھے: بنوخزاعہ اور بنوبکر۔ ان دونوں میں آپس میں لڑائیاں ہوتی تھیں، تو بنوبکر مکہ والوں کا حلیف (ally) تھا، اور بنوخزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے۔ اب جب مسلمان اور قریش کی صلح ہوئی، اور لڑائیاں ختم ہوئیں، تو ان کو اپنی پرانی لڑائیاں یاد آئیں، اور پھر لڑائی

(۱) صحیح مسلم :۱۷۸۶و تفسیر الطبری و أسباب النزول للواحدي (سورۃ الفتح).

(۲) صحیح البخاری : ۴۸۳۳و ۴۸۴۴و صحیح مسلم :۱۷۸۵.

شروع ہوئی۔ اس موقع پر قریش نے ان کا ساتھ دیا، یہ شرط کے خلاف تھا۔ یہ مکہ والے یوں سمجھتے تھے کہ ہماری اس حرکت کا کسی کو پتہ نہیں چلے گا؛ لیکن جب قریش نے بنوبکر کا ساتھ دیا اور جس قبیلہ کے خلاف یہ حرکت کی تھی یعنی بنوخزاعہ، اس کا ایک پورا وفد مدینہ منورہ پہنچا، اور سارے حالات نبی کریم ﷺ سے بیان کیے۔ **اسی کی بنیاد پر حضور ﷺ نے مکہ والوں کو اطلاع دی کہ تمہارے جس قبیلہ نے یہ حرکت کی ہے تم ان کے ساتھ اپنا معاملہ ختم کردو، یا جتنے آدمی مارے گئے ہیں ان کی دیت ادا کردو۔ یا ہماری صلح ختم کردو۔ تو انہوں نے اس سے انکار کردیا اور کہلوادیا کہ ہاں! صلح ختم کردو۔ ان لوگوں نے کہلوا تو دیا؛ لیکن بعد میں افسوس ہوا کہ صلح ختم ہوگئی، یہ تو بڑی خطرناک بات ہوگئی۔** چناں چہ انہوں نے دوبارہ ابوسفیان کو مدینہ منورہ صلح کی تجدید (Renew) کرنے کے لیے بھیجا۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے صلح کی تجدید نہیں فرمائی۔ یہ ۸ سنہ ھ کا واقعہ ہے۔ (۱)

فتح مکہ کے لیے روانگی:

ابوسفیان کے لوٹنے کے بعد آپ ﷺ نے صحابہ کو تیاری کا حکم دیا۔ چناں چہ ۱۰۰۰۰ (دس ہزار) کا ایک بڑا لشکر حضور ﷺ کی سرکردگی میں مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوا۔ (۲) چوں کہ مکہ مکرمہ حرم ہے، **اس لیے نبی کریم ﷺ کی دلی خواہش یہ تھی کہ ہم لشکر لے کر مکہ مکرمہ پر چڑھائی کے لیے تو جارہے ہیں؛ لیکن ایسی صورت پیدا کی جائے کہ لڑائی کی نوبت نہ آئے، اور خون بہے بغیر اللہ تعالیٰ ہمیں فتح عطا فرمادے۔** اس لیے نبی کریم ﷺ نے

---

(۱) سیرۃ ابن ھشام ۲/ ۳۹۶-۳۹۷.

(۲) السیرۃ النبویۃ لابن إسحاق ص: ۵۳۷ و سیرۃ ابن ھشام: ۲/ ۳۲۲.

احتیاط برتی کہ دو سال پہلے تو عمرہ کے لیے گئے تھے، تو ان کو پتہ چل گیا تھا، اور انہوں نے مقابلہ کی تیاریاں کر لی تھیں، اور اس مرتبہ ایسی راز داری سے کام لیا کہ اتنا بڑا لشکر گیا تب بھی ان کو پتہ تک نہ ہوا۔ بلکہ جتنے ناکے تھے، ان سب کو بند کر دیا تھا تا کہ اطلاع پہنچنے ہی نہ پائے۔ مکہ مکرمہ والوں کو ڈر تو تھا ہی، کہ ہم نے صلح توڑی ہے اب کہیں حملہ نہ ہو۔ تو ان کے سردار ابوسفیان اسی فکر میں چکر لگایا کرتے تھے۔

ابوسفیان کی گرفتاری اور قبول اسلام:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنا بڑا لشکر لے کر روانہ ہوئے اور لشکر مکہ مکرمہ کے بالکل قریب مقام مرالظہر ان پہنچ گیا۔ ایک مرتبہ ان کے سردار ابوسفیان رات کو نکلے ہوئے تھے، انہوں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا لشکر ہے، چولہے جل رہے ہیں اور بہت بڑا مجمع ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لشکر ہے!!! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لشکر کے جو چوکیدار گشت کر رہے تھے۔ جن کو گشتی دستہ (patrolling army) کہا جاتا ہے۔ انہوں نے ابوسفیان کو گرفتار کر لیا۔ اسی رات ابوسفیان حضرت عباسؓ کے سمجھانے سے ایمان لے آئے۔[(۱)] بہر حال! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو خواہش تھی کہ مکہ مکرمہ والوں کو آخر تک پتہ نہ چلے؛ وہ پوری ہوئی، اور ان کو بالکل پتہ ہی نہ چلا۔ ابوسفیان باہر آئے تھے ان کو پتہ بھی تھا؛ لیکن وہ تو پکڑ لیے گئے، لہٰذا ان کو واپس جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔

الیوم یوم المرحمة:

دوسرے دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے لیے روانہ ہوئے، اور جب

(۱) السیرۃ النبویۃ لابن ھشام ۲/ ۴۰۲-۴۰۴۔

پورا لشکر مکہ کی جانب آگے بڑھا، تو حضور ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ ابوسفیان کو ایسی جگہ لے کر کھڑے رہو، جہاں سے وہ پورے لشکر کا نظارہ کریں۔ چناں چہ حضرت عباسؓ ان کو ایک تنگ جگہ پر لے کر کھڑے ہوئے۔ لشکر کے دستے گزرتے تھے، ابوسفیان پوچھتے تھے: یہ کون؟ یہ کون؟ حضرت عباسؓ انہیں بتلاتے تھے۔ (۱) یہاں تک کہ ایک بہت بڑا دستہ - جس میں حضور ﷺ کے خاص صحابہؓ تھے، ان کا جھنڈا حضرت سعد بن عبادہؓ کے ہاتھ میں تھا - گزرا، انہوں نے جب حضرت ابوسفیان کو دیکھا تو ان کو جوش آیا اور بولے کہ:

الیوم یوم الملحمة　　　الیوم تستحل الکعبة (أو الحرمة)

ترجمہ: آج تو جنگ کا دن ہے، آج تو کعبہ کو اللہ کی طرف سے خون خرابہ کے لیے حلال کیا جائے گا۔

ابوسفیان نے جب یہ بات سنی تو ڈر گئے، ان کے بعد پھر مخصوص صحابہ کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی آئی، اس میں حضور ﷺ بھی تھے۔ جب حضور ﷺ سامنے سے گزرے تو ابوسفیان نے حضور ﷺ سے کہا کہ سعد بن عبادہؓ نے کیا کہا آپ نے سنا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: کیا کہا؟ تو انہوں نے ان کی وہ بات نقل کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں! آج رحمت کا دن ہے آج تو کعبہ کی عظمت دوبالا ہو جائے گی، اور کعبہ کو غلاف پہنایا جائے گا۔ (۲) پھر حضور ﷺ نے اولاً حضرت علی کو اور پھر حضرت سعد بن عبادہ کے بیٹے قیس بن سعد کو جھنڈا

---

(۱) السیرة النبویة لابن هشام: ۲/ ۴۰۳- ۴۰۴.

(۲) صحیح البخاري: ۴۲۸۰ و قال الحافظ ضمن هذا الحدیث: ذکره الأموي فی المغازي اھ، قلت: هو سعید بن یحیی الأموي.

دینے کا حکم دیا۔

تواضع وانکساری کی لاجواب مثال:

اس طرح یہ قافلہ آگے بڑھا۔ نبیٔ کریم ﷺ اپنی اونٹنی پر سوار تھے، آپ ﷺ نے اپنے پیچھے اپنے لاڈلے اسامہ بن زید کو بٹھا رکھا تھا، اور ایسی حالت میں آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے کہ تواضع اور انکساری سے آپ ﷺ کا چہرۂ انور اتنا جھکا ہوا تھا کہ آپ کی داڑھی مبارک اونٹ کے کجاوے کی لکڑی سے لگ رہی تھی۔ (۱) اور حضور ﷺ سورۂ فتح کی شروع کی آیتیں: اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا تلاوت کر رہے تھے۔ **بخاری شریف کی روایت میں حضرت عبد اللہ بن مغفلؓ سے یہ کیفیت منقول ہے۔** (۲) **حالاں کہ یہاں سے تو آپ ﷺ نکالے گئے تھے، ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے، اور اتنے زمانے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی تو ذرہ برابر بھی اکڑ اور اتراہٹ نہیں ہے؛ بلکہ پوری تواضع اور انکساری کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں۔**

دنیا کے بادشاہ ہوتے تو نہ جانے کتنا خون بہاتے اور کیسی اکڑ کا مظاہرہ کرتے، قرآن کریم میں ایک جگہ دنیا کے بادشاہوں کا طریقہ نقل کیا گیا ہے کہ اِنَّ الۡمُلُوۡكَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡيَةً اَفۡسَدُوۡهَا وَ جَعَلُوۡۤا اَعِزَّةَ اَهۡلِهَاۤ اَذِلَّةً۔ (النمل: ۳۴) (جب وہ کسی آبادی میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو اس کو خراب و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں اور اس کے عزت والے لوگوں کو ذلیل

(۱) السيرة النبوية لابن هشام: ۴/ ۴۰۵ و دلائل النبوة للبيهقي: ۵/ ۲۹ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

(۲) صحيح البخاری: ۴۲۸۱.

بنا دیتے ہیں) **لیکن نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے موقع پر جب مکہ میں داخل ہو رہے ہیں، تو اس طرح تواضع اور انکساری کے ساتھ، روتے ہوئے، سورۂ فتح کی آیتیں پڑھتے ہوئے داخل ہو رہے ہیں۔ ذرہ برابر بھی کوئی غرور و تکبر کا اظہار نہیں ہے۔**

منہ کے بل گر کے......:

آپ ﷺ اس طرح داخل ہوئے کہ اپنی چچا زاد بہن، حضرت علیؓ کی حقیقی بہن حضرت ام ہانیؓ کے گھر پر تشریف لے گئے، غسل فرمایا، آٹھ رکعتیں ادا فرمائیں، اس کے بعد حرم میں تشریف لائے۔ (۱) آپ ﷺ اپنی اونٹنی پر تھے، مکہ والوں نے کعبہ کی چاروں طرف ۳۶۰ / بت سیسے کے ذریعہ دیوار کے ساتھ چپکائے ہوئے تھے، آپ ﷺ اپنی اونٹنی پر طواف کر رہے ہیں اور جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا. (الاسراء:۸۱) پڑھتے ہوئے اپنی لکڑی سے اشارہ کر رہے ہیں، اور بت گرتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح سارے بت سرنگوں ہو گئے۔ (۲) پھر آپ ﷺ نے عثمان بن طلحہ کے پاس سے کعبۃ اللہ کی چابی منگوائی، دروازہ کھولا اندر بھی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ وغیرہ کی تصاویر تھیں، پہلے تو آپ ﷺ نے وہ تصاویر مٹوائیں، پھر اندر داخل ہوئے۔ حضرت عثمان بن طلحہ، حضرت بلالؓ، حضرت اسامہؓ آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ہر کونہ پر اللہ تعالیٰ

---

(۱) صحيح البخاري: ۱۱۰۳.

(۲) صحيح البخاري: ۲۴۷۸ و صحيح مسلم: ۱۷۸۱ ودلائل النبوة للبيهقي ۵/ ۷۱- ۷۳ و سبل الهدیٰ و الرشاد للصالحي الشامي: ۵/ ۲۳۴ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

کی تسبیح، تحمید، تکبیر کی۔ کافی دیر کے بعد حضور ﷺ نے دروازہ کھولا۔ [۱] اور کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہوکر آپ ﷺ نے خطبہ دیا۔ اس خطبے میں بنیادی بات آپ ﷺ نے قریش کو خطاب کر کے یہ فرمائی تھی: **اے قریش! زمانۂ جاہلیت کا جو غرور ہے اور تم اپنے آباء و اجداد پر جو اتراتے ہو اللہ تعالیٰ نے وہ سب ختم کر دیا ہے۔ الناس من اٰدم و اٰدم من تراب. (سب حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا ہے)** اور پھر آیت کریمہ: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ. (الحجرات:۱۳) تلاوت فرمائی۔ چناں چہ آپ ﷺ نے یہ اعلان کر دیا کہ فخر و غرور اور قریش اپنے آپ کو سب سے اونچا سمجھتے ہیں وہ کچھ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اگر کسی کی عزت ہے، تو وہ تقویٰ اور نیک عمل کی وجہ سے ہے۔ [۲]

لاتثریب علیکم الیوم:

جب آپ ﷺ کعبہ کے اندر تشریف لے گئے، تو اتنی دیر میں پورے مکہ والے جمع ہو گئے، آپ ﷺ نے پہلے سے اعلان کر دیا تھا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو اس کو امن ہے، جو مسجد حرام میں آ جائے اس کو امن ہے، جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے اس کو امن ہے، جو اپنے ہتھیار پھینک دے، اس کو امن ہے۔ [۳] چناں چہ مکہ کے تمام کافر و غیر مسلم مسجد حرام میں موجود تھے، مسجد حرام کھچا کھچ بھری ہوئی ہے اور آپ ﷺ نے خطبہ دیا۔

---

(۱) السيرة النبوية لابن هشام: ۲/ ۴۱۱ و صحيح البخاري: ۴۲۸۰ و دلائل النبوة للبيهقي: ۵/ ۷۴.

(۲) سیرة ابن إسحاق ص: ۵۳۴.

(۳) صحيح مسلم: ۱۷۸۰ و سنن أبي داود: ۳۰۲۱ و ۳۰۲۲.

خطبہ کے آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا: اے قریش ! تمہارا کیا خیال ہے؟ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ اس کے جواب میں قریش کی طرف سے ان کے سرداروں میں سے ایک سہیل بن عمرو نے کہا: أخ كريم و ابن أخ كريم (آپ تو شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں) ہم آپ سے بھلائی ہی کی امید رکھتے ہیں۔تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں تم کو آج وہی بات کہتا ہوں ، جو حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: لا تثريب عليكم اليوم (آج تم کو کوئی طعن وتشنیع بھی نہیں کی جائے گی) اذهبوا أنتم الطلقاء (جاؤ! تم سب آزاد ہو)[۱] **دنیا میں تو دستور یہ ہے کہ کوئی معاف بھی کردے، تو ٹونٹنگ تو کرتا ہی ہے کہ جا! تیرے جیسے نالائق کو کیا کرنا، یوں کر کے ایک دو بات سنا دیتے ہیں۔مگر حضور ﷺ نے ایک جملہ بھی نہیں کہا۔یہ آپ ﷺ کے اخلاق تھے ۔جنھوں نے ۱۳؍سال تک ایسا ستایا کہ ظلم وستم کی کوئی شکل نہیں چھوڑی تھی؛ لیکن آج جب اللہ تعالیٰ نے قابو دیا تو آپ ﷺ نے اس طرح اپنے اخلاق کریمانہ کا مظاہرہ فرمایا۔** اسی کا نتیجہ تھا کہ سب کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق دی، اور سب ایمان لائے ۔ یہ آپ ﷺ کے اخلاق ہی کے نتیجہ میں ہوا۔ اس طرح مکہ مکرمہ فتح ہوا۔ اسی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سورت میں بتلایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی مدد آجائے، اور مکہ فتح ہو جائے، تو اس کے بعد آپ ﷺ دیکھیں گے کہ لوگ گروہ در گروہ، جماعت در جماعت ایمان میں داخل ہوں گے۔

---

(۱) سيرة ابن إسحاق ص: ۵۳۱ و دلائل النبوة للبيهقي :۵/ ۵۷- ۵۸.

وفود کی آمد:

دیکھیے! قریش کے علاوہ عرب کے بعض قبائل کے سامنے نبی کریم ﷺ کی حقانیت اور آپ ﷺ کا اللہ کا سچا رسول ہونا واضح ہو چکا تھا؛ لیکن قریش کے ڈر کی وجہ سے وہ ایمان نہیں لاتے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ اگر آپ ﷺ کو اپنی قوم پر غلبہ حاصل ہو جائے تو ہم بھی ایمان لے آئیں گے۔ چناں چہ جب مکہ فتح ہوا اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو قریش پر غلبہ دیا، تو حال یہ ہوا کہ جب آپ ﷺ مدینہ واپس لوٹے تو ۸ ؁ھ ختم ہو رہی تھی اور ۹ ؁ھ کا پورا سال ایسی حالت میں گزرا کہ عرب کے تمام علاقوں سے ہر قبیلہ سے وفود آتے تھے اور وہ اپنے قبیلہ کے اسلام لانے کی خبر دیتے تھے۔

بشارت یا خبر:

اگر یہ مانا جائے کہ یہ سورت فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی تو اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت دی گئی ہے۔ اور اگر بعد میں مانا جائے تو خبر دی جا رہی ہے۔ لیکن جب فتح و نصرت ہو جائے، فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ. تو آپ اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کیجیے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگیے۔

آپ نے سورت پڑھ کر سنائی تو کیا ہوا......؟؟؟

جب یہ سورت نازل ہوئی اور آپ ﷺ نے پڑھ کر سنائی تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ حضور ﷺ نے پوچھا: آپ کیوں روتے ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! اس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے رخصت ہونے کی خبر دی ہے۔ (۱) اللہ نے آپ کو دنیا میں

---

(۱) أنوار التنزيل وأسرار التأويل للبيضاوي: ۵/ ۳۴۴ (ط: دار إحياء التراث العربي بيروت).

بھیجا تھا؛ تاکہ ایمان دنیا میں پھیلے۔ پورے جزیرۃ العرب میں جب سب لوگ ایمان لے آئیں گے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب واپسی کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا میں رہنے نہیں دیں گے، اور اپنے پاس واپس بلالیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب سنا تو فرمایا: تم ٹھیک کہتے ہو۔

میں بھی یہی سمجھتا ہوں.......:

چناں چہ بخاری شریف میں بھی موجود ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے دور خلافت میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو خاص طور پر اپنے قریب رکھتے تھے، بڑے بڑے حضرات صحابہؓ جو بدریین میں سے تھے ان کی حاضری کے موقع پر بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو اپنے پاس بلانے کا اہتمام کرتے تھے۔ ان لوگوں نے ایک مرتبہ پوچھا: ہماری اولاد، ہمارے لڑکے ان کی عمر کے ہیں، ہماری حاضری کے موقع پر آپ ان کو اپنے پاس بلاتے ہیں؟ تو اس وقت حضرت عمرؓ نے جواب میں فرمایا کہ ان کا تعلق کس گھرانے سے ہے تم جانتے ہو؟ یعنی نبوت کے گھرانے سے ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر حضرت عمرؓ نے مجھ کو بلایا، یہ حضرات بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت عمرؓ نے ان لوگوں سے پوچھا: بتاؤ! اس سورت (سورۂ نصر) کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟ پھر انہوں نے سورۂ نصر پڑھی۔ انہوں نے کہا: اس میں یہ ہے کہ جب ملک فتح ہوں گے، اس وقت تم اللہ کی تسبیح بیان کرو۔ بعض تو خاموش رہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا: تم کیا کہتے ہو؟ انہوں کہا: میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے قریب

ہونے کی خبر دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا: ہاں! جو تم سمجھتے ہو میں بھی وہی سمجھتا ہوں۔ (۱)

بہر حال! اس میں ایک طرف جہاں خوش خبری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا فرمایا، وہیں یہ بھی ہے کہ جس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا میں بھیجا تھا وہ کام ہو گیا۔ تو جب مقصد پورا ہو جاتا ہے تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واپس بلا لیا جائے گا، گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موت کی خبر دی گئی ہے۔

اس سورت کے متعلق مزید باتیں آئندہ مجلس میں بیان کریں گے۔ (ان شاء اللہ)

---

(۱) صحيح البخاري: ۴۹۶۹ و ۴۹۷۰.

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ نصر

(مؤرخہ ۸/ذی قعدۃ الحرام ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۲/جولائی ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

(قسط-۲)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوذُ بِاللّٰہِ من شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّأٰتِ أَعْمَالِنَا وَ نَعُوذُ بِاللّٰہِ من شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّأٰتِ أَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ أَنْ لَّا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ أَرْسَلَہٗ إِلٰی کَافَّۃِ النَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَ دَاعِیًا إِلَی اللّٰہِ بِإِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ أَصْحَابِہٖ وَ بَارَکَ وَ سَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ۔

أعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم۔

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ ۙ﴿۱﴾ وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۲﴾ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَ اسۡتَغۡفِرۡہُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾

گذشتہ مجلس میں:

گذشتہ مجلس میں بتلادیا گیا تھا کہ سورۂ نصر قرآن پاک میں سب سے آخر میں مکمل نازل ہونے والی سورت ہے۔ اس میں باری تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ (جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے)

وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا (اور جب آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ

فوج درفوج اللہ کے دین میں داخل ہورہے ہیں)

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا۔

(تو آپ اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کیجیے اور اس سے مغفرت طلب کیجیے۔ بے شک وہ بہت زیادہ معاف کرنے والا ہے)

اس سورت سے متعلقہ بنیادی باتیں گذشتہ مجلس میں آپ کو بتلادی گئیں۔ البتہ اس سورت میں ہمارے لیے کچھ سبق بھی ہیں، ان کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

دیکھیے! اس سورت کو اللہ تعالیٰ نے اذا جاء نصر الله و الفتح. سے شروع فرمایا ہے۔ یعنی اللہ کی مدد آئے اور مکہ فتح ہوجائے، بتلایا گیا تھا کہ یہاں فتح سے فتح مکہ مراد ہے۔

جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے دو لفظ استعمال فرمائے: (۱) نصر الله (۲) والفتح ۔ جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح ۔ اگر مختصر طریقہ سے پیش کرنا ہوتو اذا جاء الفتح، جب مکہ فتح ہوجائے، تو آپ یہ کام کرو۔ یہ کہا جاتا؛ لیکن پہلے لفظ نصر الله لایا گیا۔ دو الگ الگ لفظ استعمال کرنے میں بڑی حکمت ہے۔

(۱) پہلی حکمت اور سبق یہ ہے کہ مکہ کی فتح اللہ کی مدد سے حاصل ہوگی۔ گویا **لفظ نصر الله کو پہلے لاکر ایک سبق دیا کہ آدمی کو جب بھی کسی چیز میں کامیابی حاصل ہوگی تو اس کامیابی کا سبب اور ذریعہ اللہ کی مدد ہوگی۔** یہ بنیادی چیز ہے۔ ہم اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں مختلف مقاصد حاصل کرنے کے لیے محنت کرتے اور مختلف اسباب اختیار کرتے ہیں، نتیجۃً جو کامیابی حاصل ہوتی ہے، وہ اسباب کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ اللہ کی مدد سے حاصل ہوتی ہے۔

جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے　　　جو کچھ ہوگا، تیرے کرم سے ہوگا

سب کچھ اللہ ہی کی مدد سے ہوا کرتا ہے، کوئی اور مؤثر نہیں ہے۔ اگر دشمن کے مقابلہ میں جنگ ہو رہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی (جیسا کہ یہاں فتح کا تذکرہ ہے) تو وہ فتح اسباب کی وجہ سے، زورِ بازو کی وجہ سے، ساز و سامان کی وجہ سے یا تدابیر کی وجہ سے حاصل نہیں ہوئی؛ بلکہ اللہ ہی کی مدد سے حاصل ہوئی۔

ہم روزگار کے لیے محنت و کوشش کرتے ہیں، اور کامیابی حاصل ہوتی ہے، تو ہمیں اس موقع پر یہ چیز مستحضر رکھنی چاہیے اور اس بات کا یقین رکھنا چاہیے کہ جو کچھ حاصل ہوا وہ اللہ کی مدد اور اس کے کرم سے حاصل ہوا۔ ہمارے زورِ بازو اور ہماری محنت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اصل مؤثر اللہ تعالیٰ کی مدد ہے۔

آپ قرض کی ادائیگی کے لیے محنت کر رہے ہیں اور قرض ادا ہو گیا تو یہ نہ سمجھیں کہ میں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ نہیں! بلکہ اللہ کی مدد اور اس کے کرم سے قرض ادا ہوا۔

آپ اولاد کے حصول کے لیے محنت کر رہے ہیں اور اولاد حاصل ہو جائے، تو اس میں آپ کے زورِ بازو کا اور آپ کی کسی تدبیر کا دخل نہیں؛ بلکہ اللہ کے فضل و کرم اور اس کی مدد سے یہ کام ہوا۔

ایک طالب علم نے محنت کی، اور امتحان میں اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوا، تو اس کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ میں اپنی محنت کی وجہ سے کامیاب ہوا ہوں؛ بلکہ اللہ کے فضل و کرم اور اس کی مدد سے یہ کامیابی حاصل ہوئی۔

انسان کے بس کی بات نہیں:

الغرض! ہر جگہ اصل اللہ کی مدد ہے، اور اس کا فضل و کرم ہے۔ جب بھی آپ کو کسی

شعبہ میں، کسی میدان میں، کسی بھی موقع پر کامیابی ملے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرو اپنی طرف نہیں۔ ایک مؤمن کے دل ودماغ میں ہمیشہ یہ چیز مستحضر رہنی چاہیے۔ اس لیے کہ **اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیا کو دارالاسباب بنایا ہے، اور انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اسباب جمع کرلے، اور انہیں اختیار کرلے؛ لیکن ان اسباب میں اثر ڈالنا، اور اس کے بدلہ میں مطلوبہ نتیجہ حاصل ہونا، یہ انسان کے بس کی چیز نہیں ہے، جب تک اللہ کی مدد شامل حال نہ ہو۔**

یہ نہ کہیے:

آپ بیمار ہوئے، ڈاکٹر کے پاس گئے، علاج کیا، پیسے خرچ کر کے دوائی لی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے صحت عطا فرمائی، تو یہ نہ کہیے کہ دوائی سے تندرستی حاصل ہوئی، فلاں ڈاکٹر کے علاج سے صحت حاصل ہوئی۔ نہیں! بلکہ اللہ کے حکم سے حاصل ہوئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی بیماری ہے، ایک ہی ڈاکٹر ہے، ایک ہی دوا ہے؛ لیکن ایک آدمی کو فائدہ حاصل ہوتا ہے، شفا اور صحت حاصل ہوتی ہے، اور دوسرے کو حاصل نہیں ہوتی۔ اگر کسی دوا ہی کا اثر ہوتا یا ڈاکٹر کی تدبیر ہی کی کرشمہ سازی ہوتی یا اس کی کسی کوشش کا دخل ہوتا، تو اس صورت میں ہر ایک کو شفا ملنی چاہیے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اسباب کسی کے حق میں کارگر ہوتے ہیں اور کسی کے حق میں نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتے ہیں فیصلہ کرتے ہیں، اللہ کی مدد ہی سے کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

گاہک کون بھیجتا ہے؟

تجارت کرتے ہیں، کماتے ہیں، بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ میں نے کمایا، میرے زورِ بازو سے یہ چیز حاصل کی ہے۔ **بھائی! آپ نے کیا کیا؟ صرف ایک**

دکان کھولی، ذاتی یا کرایے کی، اس میں کمپنی سے یا کسی اور بڑی دکان سے سامان لاکر رکھ دیا، گویا تجارت کے لیے جو اسباب ہونے چاہیے وہ آپ نے اختیار کر لیے۔لیکن گاہک کون بھیجتا ہے؟ خریدنے والوں کے دل میں کون ڈالتا ہے کہ وہ آپ کی دکان پر آ کر خریداری کریں؟ بیشک وہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ اس میں آپ کے اِن اسباب و وسائل کو کوئی دخل نہیں ہے۔

کرشمہ قدرت کا:

ہم نے ایسے منظر بہت دیکھے اور آپ بھی دیکھتے ہوں گے کہ دو دکانیں ہیں، جیسے فرسان والوں کی دکانیں، نوساری میں کسی زمانہ میں ایک دکان کا فرسان (ફરસાણ) مشہور تھا، اس کے پڑوس میں دوسری دکان بھی فرسان (ફરસાણ) کی تھی، اس کے پاس بھی ہو بہو اسی طرح کا مال ہوتا تھا؛ لیکن پہلی دکان پر بھیڑ لگی ہوتی تھی، اس کو فرصت نہیں ہے۔اور دوسری دکان پر ایک بھی گاہک نہیں ہے۔گاہک کے دل میں ڈالنا کہ اسی کی دکان سے خریدے، یہ کس کا کام ہے؟ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے!!! کوئی یوں نہ سمجھے کہ یہ میرا کمال ہے۔

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ:

کوئی طالب علم یوں نہ سمجھے کہ میری محنت سے ہوا۔کیوں کہ جس طرح وہ رات بھر جاگا ہے، اسی طرح دوسرے بھی رات بھر جاگے ہیں، انہوں نے بھی کتاب کا مطالعہ کیا ہے، انہوں نے بھی امتحان کے لیے ویسی ہی تیاری کی ہے، جیسی اس نے کی؛ بلکہ وہ اس سے زیادہ بیدار رہے ہیں، اور زیادہ محنت کی ہے؛ لیکن ان کو اتنے مارکس اور اتنے نمبر نہیں ملے جتنے اس کو ملے ہیں۔ یہ جو کچھ بھی ہوا، وہ اللہ کی مدد سے، اللہ کے کرم اور فضل سے ہوا۔

پھر کبر پیدا نہ ہوگا:

گویا اللہ تعالیٰ نے یہاں لفظ نصر اللہ بڑھایا، تو اصل تو فتح آئی ہے؛ لیکن فتح کیسے آئی؟ اللہ کی مدد سے۔ اللہ تعالیٰ نے اس لفظ کا اضافہ کر کے ہم لوگوں کو یہ سبق دیا ہے کہ کسی بھی میدان میں آپ کو جب بھی کامیابی حاصل ہوگی، تو اس کامیابی میں اصل چیز اللہ کی مدد اور اس کا فضل وکرم ہے۔ جب بھی کوئی کامیابی حاصل ہوگی آپ کے کسی زورِ بازو کو، آپ کی کسی تدبیر کو، آپ کی کسی محنت کو اور آپ کے کسی کمال کو اس میں دخل نہیں ہے۔ یہ بات آپ ہمیشہ اپنے ذہن میں بٹھائے رکھیے۔ جب آدمی یہ بات اپنے دل و دماغ میں بٹھائے رکھے گا، تو اس کی نظر اللہ پر ہوگی کہ میرے کام بنانے والا تو اللہ ہے۔ اور پھر اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ کبر پیدا نہیں ہوگا۔ پھر وہ اللہ کا شکر ادا کرے گا کہ اللہ تیرا شکر ہے تو نے مجھے اس چیز میں کامیابی عطا فرمائی۔ بہر حال! ہمیں پہلا سبق یہ دیا گیا کہ ہر کامیابی کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی مدد ہے۔ اس لیے یہاں لفظ نصر اللہ کو پہلے لایا گیا۔

کامیابی کے بعد دو کام کرے:

(۲) دوسرا سبق اور حکمت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ آدمی کو کامیابی عطا فرمائے، تو کامیابی کے بعد اس کو کیا کرنا چاہیے؟ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَ اسۡتَغۡفِرۡهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (آپ اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کیجیے۔ اور اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی مانگیے) کامیابی کے بعد یہ دو کام کرنے ہیں: (۱) اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرنی ہے۔ گویا اس نعمت کے ملنے پر اللہ کی تعریف کی جائے گی، اللہ کا شکر ادا کرو کہ اللہ تیرا احسان ہے کہ تو نے مجھے اس میں کامیابی عطا فرمائی۔ اگر تیری طرف سے اس میں کامیابی نہ ڈالی

جاتی، تو میری تدبیر کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا شکر ادا کرو۔

شیطان کبر کی راہ سے برباد کرتا ہے:

شکر کی طرف کیوں متوجہ کیا گیا؟ اس لیے کہ آدمی جب شکر ادا کرے گا تو تکبر سے بچے گا، کیوں کہ انسان کو جب کسی میدان یا شعبہ میں کامیابی حاصل ہوتی ہے، تو پہلے اس میں اکڑ اور غرور پیدا ہوتا ہے کہ میری محنت و کوشش سے، میرے زورِ بازو سے میں نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ سے نظر ہٹ جائے گی اور آدمی کبر میں مبتلا ہوگا، اور شیطان اسی کبر کی راہ سے اس کو برباد کر دے گا۔ اس کے بجائے اگر شکر ادا کرے گا کہ اللہ تیرا شکر اور احسان ہے کہ تو نے مجھے محض اپنے فضل سے یہ چیز عطا فرمائی، اس میں میری کسی سعی کو دخل نہیں ہے، تو اس صورت میں کبر پیدا نہیں ہوگا۔

دیکھیے! فتح مکہ کے موقع پر کیا ہوا؟ بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوتے وقت اپنی اونٹنی پر سوار تھے، پیچھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لاڈلے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورۂ فتح کی ابتدائی آیتیں: اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا ۙ﴿۱﴾ لِّيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكَ وَيَهۡدِيَكَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا (الفتح:۱-۲) بڑے ترنم کے ساتھ پڑھ رہے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گردن جھکی ہوئی تھی، اتنی جھکی ہوئی کہ آپ کی داڑھی مبارک کجاوے کی لکڑی کے ساتھ لگ رہی تھی۔ (قد مر تخریجہ ص: ۱۳۳)

جس نے زخم کھا کر پھول برسائے:

حالاں کہ دنیا کا دستور یہ ہے کہ جب کوئی بادشاہ کوئی ملک فتح کرتا ہے تو بڑی اکڑ

کے ساتھ سینہ تان کر اس آبادی میں داخل ہوتا ہے۔ اور اس آبادی میں رہنے والوں کے ساتھ بھی ظلم وزیادتی کا معاملہ کرتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے دنیا کے بادشاہوں کا یہ وطیرہ اور طریقہ بتلایا ہے: اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً. (النمل:۳۴) (دنیا کے بادشاہوں کا حال یہ ہے کہ جب وہ کسی آبادی میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں، تو اس آبادی کو برباد کر ڈالتے ہیں اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر ڈالتے ہیں)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا حال تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بغیر کسی تکبر کے، بغیر کسی اکڑ کے، بغیر سینہ تانے؛ بلکہ اپنے سر کو جھکائے ہوئے پوری تواضع، عجز وانکساری کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں اور یہ آبادی بھی کون سی؟ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ۱۳ر سال تک خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ کو ظلم وستم کی چکی میں پیسا تھا۔ ظلم وزیادتی کی کوئی شکل ایسی نہیں تھی جو انھوں نے چھوڑی ہو، ہر طرح سے ستایا تھا۔ اور پھر مکہ سے جانے کے بعد بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ دوسرا کوئی ہوتا تو پتا نہیں کتنی خون کی ندیاں بہا دیتا؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کچھ نہیں کیا حالاں کہ حرم تو امن کی جگہ ہے، وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا. (آل عمران:۹۷) جو اس میں داخل ہو گیا مامون ہو گیا، اس کو کوئی چھیڑ نہیں سکتا؛ لیکن اس روز اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خون بہانے کی اجازت دی تھی۔

رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز:

چناں چہ فتح مکہ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو خطبہ دیا تھا، اس میں یہ بات فرمائی تھی کہ جس دن سے اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو پیدا کیا ہے اس دن سے مکہ کو حرمت والا

بنایا ہے، اس میں کسی کا خون بہانا کسی کے لیے جائز نہیں؛ البتہ میرے لیے اللہ تعالیٰ نے دن کے ایک حصہ (یعنی جس دن مکہ فتح ہوا، اس دن صبح سے لے کر شام تک) میں اس کو حلال کیا تھا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملی تھی۔[1] پھر بھی آپ ﷺ نے ایسی تدبیر کی تھی کہ مقابلہ اور خون بہانے کی نوبت نہ آئے، اور مکہ والوں کو پتا چلے بغیر آپ ﷺ وہاں پہنچ جائیں، تاکہ اچانک پہنچے ہوئے اس لشکر کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے مکہ والے اپنے آپ کو سپرد کر دیں اور قتل و قتال کی نوبت نہ آنے پائے۔ چناں چہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔ نیز ان سے کوئی بدلہ بھی نہیں لیا؛ **آپ ﷺ کعبہ میں تشریف لے گئے، باہر نکل کر کعبۃ اللہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا، اور اس کے بعد آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ آپ مجھ سے کیا امید رکھتے ہو؟ میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ تو اس کے جواب میں ان لوگوں نے کہا: أخ كريم و ابن أخ كريم (شریف بھائی ہیں، اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں) ہم آپ سے اچھی ہی امید رکھتے ہیں۔** چناں چہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تم سے وہی کہوں گا جو حضرت یوسفؑ نے کہا تھا: قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، اذهبوا انتم الطلقاء (یوسف:۹۲) (آج تم پر کوئی سرزنش نہیں) (قد مر تخریجه: ۱۳۶) جب کہ دنیا کا دستور یہ ہے کہ کوئی کسی کو معاف بھی کر دے، تو اس کا دماغ ٹھیک کرنے کے لیے دو چار سخت جملے تو سنا ہی دیتا ہے۔ اور حضور ﷺ کوئی سرزنش نہیں کر رہے ہیں، کوئی ٹونٹنگ نہیں، اسی کا نتیجہ تھا کہ تمام مکہ والے اسی وقت ایمان لے آئے۔ ۱۳ر سال کی محنت میں اتنی بڑی تعداد میں ایمان نہیں لائے تھے؛ لیکن آپ ﷺ کے ان اخلاق کو دیکھ کر ان سب نے ایمان قبول کر لیا تھا۔

---

(۱) أخرجه البخاري برقم: ۱۰۴.

ترا مال ونعمت فزاید زشکر:

فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَ اسۡتَغۡفِرۡهُ کہہ کر یہ سبق دیا گیا کہ جب اللہ کی کوئی نعمت حاصل ہو تو اس پر اللہ کی حمد وثنا اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اللھم لک الحمد کلہ و لک الشکر کلہ، تیری ہی تعریف ہے، تیرا ہی شکر ہے۔

اور شکر کی وجہ سے فائدہ ہی فائدہ ہے، دنیا کا بھی فائدہ ہے اور آخرت کا بھی فائدہ ہے۔ دنیا کا فائدہ یہ ہے کہ شکر کی وجہ سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے، قرآن پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ . (ابراھیم: ۷) (اگر تم میری نعمتوں کا شکر ادا کروگے، تو میں اس میں زیادتی کروں گا، اور اگر ناشکری کی تو میرا عذاب بہت سخت ہے) آپ کو اللہ تعالیٰ نے تندرستی دی، جب یہ تصور کرو تو فوراً اللہ کا شکر ادا کرو کہ اللہ تیرا شکر و احسان ہے، تو نے ہمیں تندرستی عطا فرمائی۔ تیرا شکر و احسان ہے کہ تو نے اہل وعیال عطا فرمائے۔ تیرا شکر و احسان ہے تو نے ہمیں گھر عطا فرمایا۔ تیرا شکر و احسان ہے کہ تو نے عافیت والی روزی عطا فرمائی۔ جس موقع پر جو بھی نعمت یاد آوے اللہ کی تعریف بیان کریں۔ صبح میں گھر سے نکلے، باہر جانا ہے، سواری مل گئی تو الحمد للہ، اللھم لک الحمد کلہ ولک الشکر کلہ منزل پر بروقت پہنچ گئے، تو الحمد للہ، اللھم لک الحمد کلہ ولک الشکر کلہ ھر واپس آئے، گھر میں داخل ہوتے ہی گھر والوں کو امن و امان میں دیکھا، کسی کو کوئی پرابلم (Problem) نہیں ہے، کوئی پریشانی نہیں ہے، سب صحت مند ہیں، تو الحمد للہ، اللھم لک الحمد کلہ ولک الشکر کلہ اس سے بڑی نعمت اور کیا ہے؟ ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ آئے تو دیکھا کہ بچہ بیمار ہے، بیوی بیمار ہے، اور یہ دیکھ کر آپ کو اچانک

جھٹکا لگتا۔ لہٰذا ہر موقع پر اللہ کا شکر ادا کیجیے۔ اس شکر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نعمت میں اضافہ فرماتے ہیں، یہ تو دنیا کا فائدہ ہے۔

بدست آوری دولت جاوداں:

آخرت کا فائدہ یہ ہے کہ شکر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آدمی کو جنت میں داخل فرمائیں گے۔ شکر کی وجہ سے آدمی شیطان کے حملہ سے محفوظ رہتا ہے۔ جیسا کہ گذر چکا نعمت کے ملنے پر شیطان تو انسان کا ذہن یہ بناتا ہے کہ یہ نعمت تیرے زورِ بازو سے، تیری محنت سے، تیری تدبیر اور کوششوں سے تجھے حاصل ہوئی؛ لیکن جب شکر ادا کرے گا تو شیطان کبر میں مبتلا کرنے کے لیے جو ذہن بنا سکتا تھا وہ نہیں بنے گا۔ شیطان کے حملہ سے بچ جائے گا۔

نفس جزبہ شکرِ خدا برمیار:

دیکھیے! شیطان کا بڑا حملہ اسی پر ہوتا ہے کہ آدمی اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کرے۔ قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ نہ کرنے کی بنا پر جب اپنی بارگاہ سے مردود کیا، تو اس نے اللہ کے سامنے قسم کھا کر کہا تھا: لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ۔(الاعراف: ۱۷) (میں آدم کی اولاد کو گمراہ کرنے کے لیے ان کے سامنے سے، ان کے پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے آؤں گا) اور میرے اس حملہ کا نتیجہ کیا ہوگا؟ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ۔(الاعراف: ۱۷) (ان میں سے اکثر کو تو شکر گزار نہیں پائے گا) شیطان کا سب سے پہلا حملہ یہی ہوتا ہے کہ وہ آدمی کو شکر سے دور رکھتا ہے۔

ہماری حالت:

ہماری حالت بھی عجیب ہے، **جب پریشانی ہوتی ہے،تو دعائیں کرتے ہیں کہ اللہ! یوں ہوجائے، یوں ہوجائے۔ کہیں سفر میں جارہے ہیں،تو دعائیں کرتے ہیں: اے اللہ! ٹرین مل جائے،ٹرین میں اچھی جگہ مل جائے۔اب ٹرین بھی مل گئی،جگہ بھی مل گئی؛لیکن زبان پرشکر کا لفظ نہیں آتا۔** پھر آگے کا سوچتے ہیں،ٹرین وقت پر پہنچ جائے، میں وہاں اتر جاؤں، میرا کام ہوجائے۔اپنی سب حاجتیں تو مانگتے رہتے ہیں؛لیکن جوں جوں حاجتیں پوری ہوتی جاتی ہیں، اس پر جو شکر ہونا چاہیے وہ ہم نہیں کررہے ہیں۔حالاں کہ جس طرح حاجتیں مانگیں، ہر حاجت کے پورا ہونے پر اللہ کا شکر بھی ادا کرنا چاہیے؛لیکن شیطان شکرادا کرنے نہیں دیتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت داوٗد علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کو حکم دیا تھا: اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكۡرًا ؕ وَ قَلِيۡلٌ مِّنۡ عِبَادِىَ الشَّكُوۡرُ. (سبا:۱۳) (اے داوٗد کے گھرانے والو! (یا خود حضرت داودؑ کو حکم دیا جارہا ہے) کہ آپ شکر کرو، اور میرے بندوں میں شکر کرنے والے بہت کم ہیں)۔

شکر بہت کم ادا کیا جاتا ہے۔انسان کا مزاج ہی یہ ہے کہ اس کو سو(۱۰۰)نعمتیں ملی ہوں، اور ایک نہ ملی ہو،تو جو نہیں ملی ہے اسی کو پکڑے رکھے گا۔اور کسی کے سامنے بھی اسی کا تذکرہ کرے گا۔

ذرا سا بخار آگیا ہے......!!!

حضرت مولانا سید میاں اصغر حسینؒ ہمارے اکابر میں سے ہیں، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان کے گھر گیا تو حضرت کو بخار تھا۔میں نے کہا: حضرت کیا

حال ہے؟ فرمانے لگے: الحمدللہ! میری آنکھیں سلامت ہیں، دیکھنے کا کام کر رہی ہیں۔ کان سلامت ہیں، سننے کا کام کر رہے ہیں۔ میری زبان سلامت ہے، بولنے کا کام کر رہی ہے۔ میرے ہاتھ ٹھیک ہیں۔ میرے پاؤں ٹھیک ہیں۔ دیر تک گنواتے رہے۔ پھر فرمایا: بس! ذرا سا بخار آ گیا ہے۔ ہم نعمتوں کو نہیں دیکھتے۔ جو چیز نہیں ملی ہے اسی کو پکڑ کر بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ ہمارا ناشکری والا مزاج ہے۔

ایک آدمی کو آپ نے گلاس میں پانی دیا، وہ پورا بھرا ہوا نہیں ہے، آدھا ہے۔ تو جو شکر والے مزاج کا ہوگا وہ کہے گا: الحمدللہ! آدھا گلاس پانی مل گیا۔ اور جو ناشکری والا ہوگا وہ کہے گا: یہ آدھا تو خالی ہے!!! اس کی نظر خالی پر جائے گی۔ اور جو شکر والے مزاج والا ہوگا اس کی نظر بھرے ہوئے حصہ پر جائے گی۔

بخار بھی نعمت ہے...... کیسے؟

یہ بخار بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اس بخار کی وجہ سے تمھارے سب بچے ارد گرد آ کر بیٹھ گئے، دوستوں کے فون آ رہے ہیں کہ بھائی! کیا ہوا؟ سنا ہے کہ آپ کو بخار ہو گیا ہے ہم آپ کے لیے دعا کرتے ہیں۔ لوگ خیریت پوچھتے ہیں۔ اس بخار سے تو آپ کو پتا چل گیا کہ کون کون آپ سے محبت کرتا ہے؟ دنیا میں کتنے لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں، اب تک آپ کو اس کا اندازہ نہیں تھا، لیکن اس بخار نے آپ کو یہ سب بتلا دیا!!! تو یہ کوئی مصیبت نہیں؛ بلکہ ایک نعمت ہے۔

تو چاہتا تو......:

حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تعریف فرمائی ہے:

اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا. (الاسراء:۳) (وہ شکر گزار بندے تھے) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جب آپ کھانا کھاتے تھے، تو یوں کہتے تھے: اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے کھانا دیا، تو چاہتا تو بھوکا بھی مار سکتا تھا۔ جب پانی پیتے تو یوں کہتے تھے: اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے سیراب کیا، تو چاہتا تو پیاسا بھی رکھ سکتا تھا۔ جب لباس پہنتے تو کہتے تھے کہ: اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے لباس عطا فرمایا، تو چاہتا تو ننگا بھی رکھ سکتا تھا۔ اور جوتے پہنتے تو کہتے: اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے جوتے عطا فرمائے، تو چاہتا تو ننگے پیر بھی رکھ سکتا تھا۔ گویا ہر چیز پر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔ اس شکر کا فائدہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ شکر کی وجہ سے میں نعمتوں میں اضافہ کروں گا۔ تو آدمی کو چاہیے کہ ہر وقت شکر ادا کرنے کا اہتمام کرے۔

پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا:

فتح آنے پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی کہا جا رہا ہے کہ شکر ادا کرو، اور اپنے گناہوں کی معافی مانگو، استغفار کرو۔ اب دیکھیے! شکر ادا کرنا اور معافی مانگنا دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ جب آپ ﷺ کی بعثت ہوئی تو جزیرۃ العرب کا کیا حال تھا؟ جہالت میں پڑے ہوئے تھے، گناہوں کے عادی تھے، قتل و غارت گری کے عادی تھے، شراب اور زنا کے عادی تھے۔ کون سی برائی تھی جو اُن میں نہ تھی۔ اسی لیے جب آپ ﷺ پر پہلی وحی آئی اور اس کی وجہ سے آپ ﷺ پر جو ذمہ داری آئی تو آپ اس ذمہ داری سے ڈر رہے تھے۔ حضور ﷺ نے آکر حضرت خدیجہؓ سے کہا: <u>إني أخاف على نفسي مجھے اندیشہ معلوم ہوتا ہے۔ حضرت گنگوہیؒ اس جملہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اندیشہ یہ تھا کہ اس قوم کو سدھارنے کی اتنی بڑی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر ڈالی گئی ہے</u>

اوراس قوم کا تو یہ حال ہے!!! میں کیسے اس ذمہ داری کو پورا کرسکوں گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ڈر رہے تھے۔(۱) لیکن اللہ تعالیٰ نے سب کروایا۔ ۲۳ ؍سال کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے جا رہے ہیں تو پورے جزیرۃ العرب کی کایا پلٹ گئی تھی۔ جو بری بری عادتیں ان میں تھیں وہ ساری چھوٹ چکی تھیں۔ شراب کے بڑے عادی تھے، حالاں کہ شراب کی لت ایسی لت ہے جیسے کسی کو تمبا کو کھانے کی یا گٹکھا کھانے کی لت پڑ جائے تو آسانی سے چھوٹتی نہیں ہے، شراب کا حال بھی ایسا ہی ہے، جلدی سے چھوٹتی نہیں ہے؛ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت کا نتیجہ یہ تھا کہ جب شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا تو - سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں بتلا چکا ہوں کہ - اس وقت لوگ ایک مکان میں بیٹھ کر شراب پی رہے تھے، مجلس لگی ہوئی تھی، ہاتھ میں جام ہے، اور باہر اعلان ہوا کہ شراب حرام کردی گئی ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ جو وہاں موجود تھے، خدمت کر رہے تھے، ان سے لوگوں نے کہا کہ دیکھو باہر کیا اعلان ہورہا ہے؟ انہوں نے آکر کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اعلان کرنے والا اعلان کر رہا ہے کہ شراب حرام کردی گئی ہے، تو جس کے ہاتھ میں جام تھا وہ ہاتھ میں ہی رہ گیا، ہونٹ کے قریب تھا اس کو بھی ہٹا لیا، اور جو شراب کے مٹکے بھرے ہوئے تھے اسی وقت توڑ دیے گئے، اور مدینہ منورہ کی گلیوں میں شراب بہنے لگی۔ (۲) یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی معمولی کارنامہ تھا؟ نہیں۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم فرمارہے ہیں: فسبح بحمد ربک گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ نہیں سوچنا ہے کہ میں نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے، آپ اللہ کی تسبیح اس کی حمد کے ساتھ بیان کیجیے۔

---

(۱) لامع الدراري ۱/ ۵-۲ (ط: المکتبة الرشيدية، سهارنپور، يوپي).

(۲) أخرجه البخاري برقم: ۲۳۳۲ و مسلم برقم: ۱۹۸۰.

استغفار کیوں......؟؟؟

وَ اسْتَغْفِرْهُ: استغفار کیجیے۔ آدمی کوئی گناہ کرے تو اس پر استغفار ہوتا ہے، حضور ﷺ سے ۔نعوذ باللہ۔ کیا غلطی ہوئی تھی؟ پھر بھی آپ ﷺ کو استغفار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: فرماتے ہیں کہ جب نماز ختم ہوتی تو نبی کریم ﷺ سلام پھیرتے اور زور سے اللہ أکبر کہتے تو مجھے پتا چل جاتا کہ نماز مکمل ہو چکی۔ (۱) اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نماز کے بعد تین مرتبہ استغفر الله! استغفر الله! استغفر الله! پڑھتے تھے۔ (۲) نماز پڑھنے کے بعد استغفر الله! کہا جا رہا ہے! قرآن کریم میں ہے:

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ . (الذٰريٰت: ۱۷، ۱۸)

رات میں بہت کم سوتے ہیں، اور جب رات کا آخری حصہ آتا ہے تو اپنے گناہوں سے استغفار کرتے ہیں۔ رات بھر تو نماز پڑھتے رہے، کوئی گناہ کا کام تھوڑا کیا تھا؟ پھر بھی وہ استغفار کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ کی توفیق سے نماز پڑھی ہے؛ لیکن آدمی کو یوں سمجھنا چاہیے کہ نماز کا جو حق ہمیں ادا کرنا چاہیے تھا وہ ہم سے ادا نہیں ہوا۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز ملائکہ کہیں گے: ما عبدناک حق عبادتک (ہم نے تیری عبادت جیسی کرنی چاہیے ویسی نہیں کی) (۳) اسی لیے عبادات کے آخر میں استغفار ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ افطار کے وقت پڑھتے تھے: يا واسع المغفرة اغفر لي (اے معاف کرنے والے! میرے گناہوں کو معاف کر

---

(۱) صحيح البخاري: ۸۴۱ و ۸۴۲.

(۲) صحيح مسلم: ۵۹۱.

(۳) أخرجه الحاكم في المستدرك: ۴/ ۶۲۹ [۸۷۳۹] (ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

دے)[1] عام طور پر عبادات کے آخر میں استغفار رکھا گیا ہے، وہ اسی لیے کہ جو ذمہ داری ہم پر ڈالی گئی تھی ہوسکتا ہے کہ اس کی ادائیگی میں ہم سے کوتاہی ہوئی ہو۔

بہرحال! اللہ تعالیٰ جب کسی نعمت سے نوازے تو آدمی کو دو کام کرنے چاہیے:

(۱) اللہ کی حمد وثنا بیان کرتے ہوئے اس کا شکر ادا کرنا ہے۔

(۲) استغفار کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

---

(۱) شعب الإيمان للبيهقي: ۴۰۷/۵ [۳۶۲۰] (ط: مكتبة الرشد، ممباي، الهند).

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۂ کافرون

(مؤرخہ: ۱۵/ذی قعدۃ الحرام ۱۴۳۹ھ - مطابق: ۲۳/جولائی ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

(قسط-۱)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ من شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا وَ نَعُوذُ بِاللّٰہِ من شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ أَنْ لَّآ إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ أَرْسَلَہٗ إِلیٰ کَافَّۃِ النَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَ دَاعِیًا إِلیٰ اللّٰہِ بِإِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا صَلّٰی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَ عَلیٰ اٰلِہٖ وَ أَصْحَابِہٖ وَ بَارَکَ وَ سَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا. أَمَّا بَعْدُ.

أعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم. بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم.

قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ ﴿۱﴾ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲﴾ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ﴿۳﴾ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ﴿۴﴾ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ﴿۵﴾ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ ﴿۶﴾ .

شانِ نزول:

یہ سورۂ کافرون ہے۔

(۱) اس کے شان نزول کے بارے میں بتلایا گیا ہے کہ جب پورا عرب بت پرستی میں مشغول تھا، اور وہی ان کا دین اور مذہب تھا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید کی دعوت دی کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور اپنی تمام صفات میں وہ یکتا ہے، اسی کی عبادت کرو، کسی کو اس کے

ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سعادت مند بندوں کو توفیق عطا فرمائی، اور انہوں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے ایمان قبول کیا، اور توحید پر عمل کرنے لگے۔ اچھی خاصی تعداد مکہ مکرمہ میں بھی اہل ایمان کی ہوگئی۔ لیکن بڑی تعداد وہ تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں لائی تھی، بالخصوص سرکردہ لوگ، ان کی اکثریت نے دعوت ایمان کو قبول نہیں کیا تھا۔ اور وہ لوگ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والے اہل ایمان پر ظلم کے پہاڑ توڑتے تھے۔ اب اس موقع پر چوں کہ ایمان والوں اور کافروں کے درمیان ایک کشمکش رہتی تھی، تو بعض سرداران قریش نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے صلح کی پیشکش کی۔ چناں چہ سردارانِ قریش، حارث بن قیس سہمی، عاص بن وائل، ولید بن مغیرہ، اسود بن عبد یغوث، اسود بن مطلب، امیہ بن خلف، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں صلح کی یہ صورت لے کر آئے کہ آپ ایسا کریں کہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں اور ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں۔ گویا اس طرح ہمارے درمیان جو کشمکش اور جھگڑا ہے وہ ختم ہو اور صلح کی کوئی صورت پیدا ہو۔ اس کے جواب میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ (۱)

(۲) بعض روایات میں یہ بھی وارد ہے کہ ان لوگوں نے کہا کہ آپ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہیں، ان کی برائی بیان کرتے ہیں، یہ سلسلہ ختم کریں۔ آپ جتنا مال چاہیں ہم دینے کے لیے تیار ہیں۔ یا آپ عرب کی کسی حسین ترین عورت کو اپنے نکاح میں لانا چاہیں تو

(۱) تفسير عبد الرزاق الصنعاني و تفسير الطبري و تفسير ابن أبي حاتم و تفسير البغوي و تفسير ابن عطية [سورة الكفرون].

ہم اس کا بھی انتظام کیے دیتے ہیں۔ یا آپ اگر سرداری کے خواہش مند ہیں تو ہم آپ کو اپنا سردار تسلیم کیے دیتے ہیں۔ لیکن آپ ہمارے معبودوں کی برائی کا سلسلہ ختم کر دیجیے۔ (۱)

(۳) بعض روایات میں وارد ہے کہ پیشکش میں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ اللہ کی عبادت کرتے رہیں؛ لیکن ہمارے معبودوں کو بھی کم از کم ہاتھ لگا دیا کریں، بوسہ دے دیا کریں۔ (۲) انہوں نے یہی مختصر مطالبہ کیا، بہت لمبا چوڑا مطالبہ نہیں کیا۔

لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے ان مطالبوں اور صلح کی جو صورتیں پیش کی گئی تھیں، ان کے جواب میں سورۂ کافرون نازل فرمائی، جس میں ان کو صاف الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ تم شرک میں مبتلا ہو، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم توحید کے علم بردار ہیں۔ ایک موحد توحید پر قائم رہتے ہوئے کفر وشرک کی کوئی شکل اختیار نہیں کر سکتا، جیسے تم مشرک رہتے ہوئے توحید اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ تم اپنے دین پر مصر ہو، اڑے ہوئے ہو، اور میں اپنے دین پر مضبوطی سے جما ہوا ہوں۔ ہر ایک کے اپنے اپنے دین پر رہتے ہوئے، تم صلح کی جو شکل پیش کر رہے ہو وہ ناممکن ہے۔

سورت کا ترجمہ:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (آپ کہہ دیجیے کہ اے کافرو! اے حق کا انکار کرنے والو!)

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (میں نہیں عبادت کرتا اس چیز کی جس کی تم عبادت کرتے ہو)

---

(۱) تفسير الطبري وتفسير ابن عطية [سورة الكافرون].

(۲) تفسير عبدالراق الصنعاني و بحر العلوم للسمر قندي و تفسير القرآن العزيز لابن أبى زَمَنين، سورة الكفرون.

وَ لَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ (اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں)[تم بتوں کی عبادت کرتے ہو، جن کی میں عبادت نہیں کرتا۔ اور میں اللہ کی عبادت کرتا ہوں، تم اس کی عبادت نہیں کرتے]

وَ لَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ وَ لَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ. (اور آئندہ بھی میں اس چیز کی عبادت کرنے والا نہیں ہوں، جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو، جس کی میں عبادت کرتا ہوں)

لَكُمۡ دِيۡنُكُمۡ وَلِيَ دِيۡنِ (تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین)

دونوں جملوں کا مطلب مختلف ہے:

وَ لَآ اَنۡتُمۡ...: یہاں ایک ہی طرح کے جملے دو مرتبہ آئے ہیں۔ یہ دو مرتبہ ایک ہی طرح کے جملے آئے تو دونوں کا الگ الگ مطلب ہے یا ایک ہی مطلب ہے؟

(۱) امام بخاریؒ نے کتاب التفسیر میں اس سورت کی تفسیر میں دونوں کا مفہوم الگ الگ نقل کیا ہے۔[(۱)] پہلے جملے کا مطلب تو یہ ہے کہ اِس وقت (زمانۂ حال) میں ان چیزوں (تمہارے بتوں) کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور تم بھی اس ذات کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ **پہلے دو جملوں کا تعلق زمانۂ حال سے ہے۔ اور بعد میں آنے والے ان ہی دو جملوں کا تعلق زمانۂ استقبال سے ہے۔ یعنی نہ آئندہ میں ان چیزوں کی عبادت کروں گا، جن کی تم عبادت کرتے ہو، اور نہ تم اس کی عبادت**

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب التفسير [باب سورة قل يٰاَيها الكفرون] وبحر العلوم للسمر قندي و تفسير البغوي [سورة الكفرون].

کروگے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔

(۲)ان دو جملوں کا مطلب حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں یہ بیان کیا ہے:

پہلے دو جملوں (لَآ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ) میں لفظ "ما" آیا ہے۔اسی طرح دوسرے دو جملوں (وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ) میں بھی "ما" ہے، اس مجلس میں اہل علم موجود ہیں، وہ جانتے ہیں کہ لفظ "ما" عربی زبان میں اسم موصول بمعنیٰ الذي (relative pronoun) کے آتا ہے۔ اور لفظ "ما" مصدری (masculine noun) معنیٰ کے لیے بھی آتا ہے۔ اگر پہلی دو آیتوں میں لفظ "ما" سے اسم موصول بمعنیٰ الذي مراد لیں، تو عبارت یوں ہوگی: لا اعبد الذي تعبدون (جن چیزوں کی تم عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کرتا) ولا انتم عٰبدون الذي اعبد (جس ذات کی میں عبادت کرتا ہوں، اس کی تم عبادت نہیں کرتے)

اور دوسرے دو جملوں میں لفظ "ما" مصدریہ ہے۔ "ما" مصدریہ جب کسی فعل (verb) پر داخل ہوتا ہے، تو اس فعل کو مصدر کے معنیٰ میں کر دیتا ہے۔ تو اب عبارت یوں ہوگی: ولا أنا عابد عبادتَكم (یعنی تمہارے جیسی عبادت میں نہیں کرتا اور میرے جیسی عبادت تم نہیں کرتے)[(۱)] یعنی ہمارا معبود بھی الگ ہے اور عبادت کا طریقہ بھی الگ ہے۔ اور تمہارا معبود بھی الگ ہے اور عبادت کا طریقہ بھی الگ ہے۔ دونوں میں فرق ہے، جب دونوں میں فرق ہے تو بھلا جو صلح تم پیش کررہے ہو وہ کیسے ہوسکتی ہے؟

---

(۱)تفسیر ابن کثیر [سورة الكفرون].

قند مکرر:

(۳) بعض حضرات نے تیسرا مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ دونوں جگہ دونوں آیتیں ایک ہی معنی میں ہیں۔ اس صورت میں یہ اشکال ہوتا ہے کہ تکرار ہوگئی؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ تکرار ہر جگہ ناپسندیدہ نہیں ہے، کہیں پسندیدہ بھی ہوتی ہے۔ جیسے: فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا. (الشرح: ۵-۶) میں تکرار ہے، اور تکرار ہی کے معنی مراد ہیں۔ اسی طرح یہاں (سورۂ کافرون میں) بھی تکرار ہے۔ چوں کہ ایسی باتیں ان کی طرف سے بار بار پیش آتی تھیں، اس لیے اس کا جواب دینے اور اس کی نفی کرنے کے لیے ایک جملہ کو مکرر کہا گیا کہ ایسی کوئی صلح ہمارے درمیان نہیں ہوسکتی اور اس کی توقع بھی مت رکھو۔ اس صورت میں دونوں جملے ایک ہی معنی میں ہوں گے اور دوسرا جملہ پہلے جملے کی تاکید کے لیے ہے۔ (۱)

یہ تین مطلب بیان کیے گئے ہیں۔

دین سے کیا مراد ہے......؟؟

لکم دینکم ولی دین (تمہارے لیے تمہارا دین، اور میرے لیے میرا دین)

دین کا کیا مطلب ہے؟

(۱) حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے دین کا ترجمہ بدلہ سے کیا ہے۔ (۲)

---

(۱) جامع البيان للطبري و معالم التنزيل للبغوي و المحرر الوجيز لابن عطية [سورة الكفرون].

(۲) بیان القرآن سورۃ الفاتحۃ ۱/ ۲۰ (مکتبہ رحمانیہ، لاہور) (نوٹ: الدین بمعنی بدلہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن مسعود، مجاہد، مقاتل، سدی اور ابن جریج وغیرہ سے منقول ہے۔ امام طبری اور امام بغوی ==

جیسے آپ سورۂ فاتحہ میں سن چکے ہیں: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (روز جزا کا مالک، بدلہ کے دن کا مالک) یعنی تم جو اعمال کرتے ہو، تمہیں اس کا بدلہ بھگتنا ہے۔ اور میں جو اعمال کرتا ہوں مجھے اس کا بدلہ ملنے والا ہے۔ ہر ایک کو اپنے اعمال کا بدلہ ملے گا۔

(۲) بعض حضرات نے دین کا ترجمہ دین ہی سے کیا ہے۔ [۱] لیکن مراد دین کے اعمال ہیں۔ یعنی تمہارے ساتھ تمہارے اعمال، تمھیں ان اعمال کا بدلہ بھگتنا ہے۔ اور میرے ساتھ میرے اعمال، مجھے اپنے اعمال کا بدلہ ملنے والا ہے۔

مجھ سے یہ امید نہ رکھنا:

یہاں یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ ان کو اپنے کفر والے دین پر باقی رہنے کی اجازت دی جا رہی ہے۔ نہیں! بلکہ **ان کو بتلایا جا رہا ہے کہ میں موحد رہتے ہوئے تمھاری شرک والی باتوں کو قبول نہیں کرسکتا، اور تم اپنے شرک پر قائم رہتے ہوئے توحید کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو، تو اب ہر ایک کو اپنے اپنے اعمال کا بدلہ آخرت میں دیا جائے گا۔**

بہر حال! اس سورت نے نازل ہو کر ان کی پیشکش کو ختم کر دیا اور ٹھکرا دیا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان صلح نہیں ہوسکتی ہے۔ ایک مؤمن ایمان اور توحید پر قائم رہتے ہوئے کبھی کفر و شرک کو اختیار نہیں کرسکتا۔ اس لیے تم مجھ سے ایسی امید مت رکھو۔

= وغیرہ نے اسے ذکر کیا ہے۔

(۱) امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں کتاب التفسیر، باب سورۃ قل یایھا الکفرون کے تحت لکم دينكم میں دین سے کفر اور ولي دين میں دین سے اسلام مراد لیا ہے۔

فضائلِ سورۂ کافرون:

اس سورت کی فضیلت کے سلسلہ میں بھی چند روایات ہیں:

فجر کی سنت میں:

(۱) حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: فجر کی سنتوں میں پڑھنے کے لیے دو سورتیں بہتر ہیں۔ سورۂ اخلاص اور سورہ کافرون۔ (۱)

تحیۃ الطواف میں:

(۲) صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے طواف کے بعد کی دو رکعتوں میں سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص کی تلاوت فرمائی۔ (۲)

مغرب کی سنت میں:

(۳) تفسیر ابن کثیر میں بہت سارے صحابہؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو فجر اور مغرب کی سنتوں میں بہ کثرت یہ دونوں سورتیں پڑھتے ہوئے سنا۔ (۳) [اس لیے فجر اور مغرب کی سنتوں میں ان سورتوں کے پڑھنے کا اہتمام ہونا چاہیے]

(۴) ترمذی شریف کی روایت ہے کہ حضرت فروہ بن نوفلؓ نے نبی کریم ﷺ

---

(۱) أخرجه ابن خزيمة في صحيحه (۲/۱۶۳) [۱۱۱۴] (ط: المكتب الإسلامي، بيروت) وابن حبان في صحيحه (۵/۲۱۴) [۲۴۶۱] (ط: مؤسسة الرسالة، بيروت).

(۲) أخرجه مسلم برقم: ۱۲۱۸.

(۳) أخرجه الترمذي عن ابن مسعود برقم: ۴۳۱.

سے عرض کیا کہ مجھے کوئی دعا بتا دیجیے جو میں سوتے وقت پڑھا کروں۔ تو نبی کریم ﷺ نے سورۂ کافرون پڑھنے کی تاکید فرمائی اور فرمایا کہ یہ شرک سے براءت ہے۔ (۱)

خستہ حالی سے خوش حالی تک:

(۵) تفسیر مظہری میں مسند ابو یعلیٰ کے حوالہ سے ایک روایت ہے کہ حضرت جبیر بن مطعمؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جب تم سفر میں جاؤ تو تمہارے دوسرے ساتھیوں سے زیادہ خوش حال اور بامراد رہو؟ یعنی تمہاری مرادیں پوری ہوں اور تمہارا مال زیادہ ہو، اور تمہاری تجارت میں نفع زیادہ سے زیادہ ہو؟ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! بے شک میں ایسا چاہتا ہوں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: **جب سفر شروع کرو، تو آخر قرآن کی یہ پانچ سورتیں: سورۂ کافرون، سورۂ نصر، سورۂ اخلاص، سورۂ فلق اور سورۂ ناس پڑھا کرو۔ اور ہر سورت کو بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے شروع کرو، اور اسی پر ختم کرو، تو حضرت جبیرؓ فرماتے ہیں کہ پہلے میرا حال یہ تھا کہ سفر میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلہ میں بہت کم توشہ والا اور خستہ حال رہتا تھا۔** جب سے نبی کریم ﷺ کی اس تعلیم پر عمل کیا میں سب سے بہتر حال میں رہنے لگا۔ (۲) [چناں چہ بہت سے لوگوں نے اس کا تجربہ کیا تو واقعۃً بڑا فائدہ دیکھا۔ جو تجارت پیشہ ہیں ان کے لیے بھی اور دوسرے لوگوں کے لیے بھی ایک اچھا وظیفہ ہے]

---

(۱) أخرجه الترمذي برقم: ۳۴۰۳ و أبو داود برقم: ۵۰۵۵.

(۲) مسند أبي يعلىٰ الموصلي: ۱۳ / ۴۱۴ [۷۴۱۹] (ط: دار المأمون للتراث، دمشق) و تفسير مظهري (اردو) سورۂ كافرون.

چوتھائی قرآن:

(۶) حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ سورۂ کافرون چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔
[جیسے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کو تہائی قرآن بتایا، اس کو چوتھائی قرآن بتایا] (۱)

بچھو کے زہر کا تریاق:

(۷) حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کو حالت نماز میں بچھو نے کاٹ لیا، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے، تو آپ نے فرمایا: "لعن الله العقرب لا تدع مصليا و لا غيره." (بچھو پر اللہ کی لعنت ہو، کہ وہ نمازی اور غیر نمازی کسی کو نہیں چھوڑتا) **پھر آپ ﷺ نے پانی اور نمک منگوایا۔ اور نمک و پانی کو، کاٹنے کی جگہ لگاتے جاتے تھے اور** قل یایها الکٰفرون، قل اعوذ برب الفلق **اور** قل اعوذ برب الناس **پڑھتے جاتے تھے۔** (۲)

یہ اس سورت کے اہم فضائل ہیں، جو آپ کے سامنے پیش کیے گئے۔

ایسی صلح نا ممکن:

اب نبی کریم ﷺ کے سامنے ان لوگوں کی طرف سے صلح کی جو شکل پیش کی گئی تھی اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ سورت نازل فرما کر ریجیکٹ (Reject) کر دیا۔ چناں چہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ باقاعدہ حرم میں تشریف لائے، کعبہ کے پاس قریش کے سردار موجود تھے، کعبہ کے پاس کھڑے رہ کر آپ ﷺ نے ان کے سامنے زور

---

(۱) أخرجه الترمذي برقم: ۲۸۹۳.

(۲) رواه الطبراني فی المعجم الصغیر [۸۳۰] (ط: المکتب الاسلامي، بیروت).

سے یہ سورت تلاوت فرمائی۔ [۱] گویا ان کی طرف سے صلح کی جو پیشکش کی گئی تھی، اس کا اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ جواب دیا گیا۔ آئندہ بھی قیامت تک ایسی کوئی صلح ممکن نہیں ہے۔

ایک اصول:

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سورت میں کفار کے ساتھ صلح نہ ہو سکنے کا بیان ہے، حالاں کہ قرآن میں دوسری جگہ ایک آیت: وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا. (الانفال:۶۱) (یہ لوگ اگر صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی مائل ہو جایئے) بھی ہے گویا اس میں تو صلح کی اجازت دی گئی ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ دونوں آیتوں کا تعلق الگ الگ چیزوں سے ہے۔ ان لوگوں نے اُس موقع پر جس صلح کا مطالبہ کیا تھا اس میں ایک موحد کو اپنے توحید کے عقیدہ سے ہٹنا پڑتا ہے۔ اور شریعت نے جس چیز کی اجازت نہ دی ہو اور حرام قرار دیا ہو، ایسی چیز کو آپسی صلح میں تجویز کرنا درست نہیں ہے۔ یہ ایک اصول ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنے ارشاد سے اس کو واضح فرمایا ہے: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحاً حرم حلالاً أو أحل حراماً. (مسلمانوں کے درمیان ہر صلح جائز ہے، مگر وہ صلح جو شریعت کی حلال کردہ کسی چیز کو حرام قرار دیتی ہو، یا شریعت کی حرام کردہ کسی چیز کو حلال قرار دیتی ہو؛ وہ جائز نہیں ہے) [۲] جیسے: غیر لوگ صلح کریں کہ گنپتی کے جلوس کا تم استقبال کرو، اور ہم تمہارے محرم کے جلوس کا استقبال کریں گے، یا میلاد کے جلوس کا استقبال کریں گے، تو یہ درست نہیں ہے۔ ویسے میلاد اور محرم کا جلوس ہی ہمارے یہاں درست نہیں ہے۔ یہ تو ان کے

---

(۱) تفسير البغوي، سورة الكفرون.

(۲) أخرجه أبو داود برقم: ۳۵۹۴ والترمذي: ۱۳۹۲ وابن ماجة: ۲۳۵۳.

معبودوں کی تعظیم کرنا ہوا، شریعت کسی حال میں اس کی اجازت نہیں دیتی۔ یہ صلح شریعت کے نزدیک معتبر نہیں ہے۔

ہاں! اس کے علاوہ دیگر امور، جن کو شریعت نے مباح اور جائز رکھا ہے اگر ان کو آپس کی صلح سے ایک دوسرے منظور کریں، تو اس کی گنجائش ہے۔ جیسے نبی کریم ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، تو آپ ﷺ نے وہاں موجود قبائلِ یہود سے آپس میں صلح کی تھی کہ ہم آپس میں ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے اور اگر کوئی دشمن ہمارے خلاف چڑھ آئے گا، تو ہم مل کر اس کا مقابلہ کریں گے، تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

بہر حال! یہاں جس صلح کی اجازت نہیں دی گئی اور جس کو رجیکٹ کر دیا گیا وہ، وہ ہے جس کی وجہ سے شریعت کے کسی منع کیے ہوئے کام کا ارتکاب لازم آتا ہو، اس کو شریعت منظور نہیں رکھتی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ کافرون

(قسط-۲)

(مؤرخہ: ۲۲/ذی قعدۃ الحرام ۱۴۳۹ھ - مطابق: ۴/اگست ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَ نَسۡتَعِیۡنُہٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُہٗ وَ نُؤۡمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَ نَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ أَنۡفُسِنَا وَ مِنۡ سَیِّاٰتِ أَعۡمَالِنَا وَ نَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ أَنۡفُسِنَا وَ مِنۡ سَیِّاٰتِ أَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشۡھَدُ أَنۡ لَّآ إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَ نَشۡھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَ رَسُوۡلُہٗ أَرۡسَلَہٗ إِلٰی کَافَّۃِ النَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا وَ دَاعِیًا إِلَی اللّٰہِ بِإِذۡنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیۡرًا صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ أَصۡحَابِہٖ وَ بَارَکَ وَ سَلَّمَ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا أَمَّا بَعۡدُ.

أعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم. بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم.

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۚ﴿۳﴾ وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۙ﴿۴﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ؕ﴿۵﴾ لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ ٪﴿۶﴾

گذشتہ سے پیوستہ:

یہ سورۂ کافرون ہے، گذشتہ مجلس میں بتلا دیا گیا تھا کہ یہ کس پس منظر میں نازل ہوئی ہے؟ مکہ کے مشرکین کے کچھ سردار نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے، اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے صلح کا ایک فارمولہ پیش کیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ آپ کو اور آپ کے ماننے

والے لوگوں کو جو تکالیف واذیتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، اور یہاں ہمارے اور آپ کے درمیان ایک کشمکش رہتی ہے، اگر آپ ہماری اس پیشکش کو قبول کرلیں تو یہ سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا، اور ہم مل جل کر رہیں گے۔ اور انہوں نے صلح کی پیشکش اس طرح کی کہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی پوجا اور عبادت کریں، اور ایک سال آپ ہمارے معبود کی پوجا اور عبادت کریں۔ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا۔[(۱)] اور ان لوگوں کو بتلا دیا کہ بھائی! مؤمنین اور مشرکین کے درمیان صلح کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ **ایک موحد اپنی توحید پر قائم رہتے ہوئے کسی بھی شرکیہ عمل کو انجام نہیں دے سکتا، اور ایک مشرک اپنے شرک پر باقی رہتے ہوئے توحید کو ماننے والا نہیں بن سکتا۔**

ترجمہ ومطلب:

قُلۡ یٰۤاَیُّهَا الۡکٰفِرُوۡنَ (اے نبی! آپ کہہ دیجیے کہ اے کافرو! اے حق کا انکار کرنے والو)

لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ (میں ان چیزوں کی عبادت نہیں کرتا، جن کی تم عبادت کرتے ہو)

وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ (اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں) یعنی تم بتوں کی عبادت کرتے ہو، میں ان کی عبادت نہیں کرتا۔ اور میں اللہ کی عبادت کرتا ہوں، تم اس کی عبادت نہیں کرتے۔

وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ (اور نہ (آئندہ) میں اس

---

(۱) تفسیر الطبري وتفسیر ابن أبي حاتم، سورة الکٰفرون.

چیز کی عبادت کرنے والا ہوں، جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم (آئندہ) اس کی عبادت کرنے والے ہو، جس کی میں عبادت کرتا ہوں) چوں کہ یہ دو کلمے مکرر آئے ہیں، تو پہلی صورت میں اس سے زمانۂ حال مراد لیا گیا اور دوسرے دو کلموں میں زمانۂ مستقبل مراد لیا گیا ہے۔

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (تمہارے لیے تمہارا دین ہے، اور میرے لیے میرا دین ہے)

گزر چکا کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ سورت نازل فرمائی، تو نبی کریم ﷺ نے کعبہ کے پاس جا کر مشرکین کے سامنے کھڑے ہو کر بلند آواز سے سنائی؛ تا کہ ان کو پتا چل جائے۔ (۱)

پہلا سبق؛ یہ اللہ تعالیٰ کو ماننا نہیں ہے:

اس سورت سے ہمیں دو سبق معلوم ہوتے ہیں:

(۱) ایک سبق تو یہ ہے کہ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ. (تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں، یعنی اللہ کی۔ اور آئندہ بھی نہیں کرو گے) مشرکین مکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے وجود کا انکار نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کو تسلیم کرتے تھے، اور وہ یہ بھی مانتے تھے کہ ساری کائنات یعنی آسمانوں، زمین، سورج، چاند، اسی طرح انسان، جنات، جانور کو اللہ ہی نے پیدا کیا۔ قرآن پاک میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کا تذکرہ کیا ہے: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ. (العنکبوت: ۶۱) (اے نبی! اگر آپ ان سے یہ سوال کریں کہ کون سی ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا؟ اور سورج اور چاند کو گردش میں لگا دیا؟ تمہاری ڈیوٹی اور خدمت میں لگا دیا، تمہارے لیے مسخر کر دیا؟) تو باری تعالیٰ

---

(۱) قد سبق تخریجہ ص: ۱۶۷.

فرماتے ہیں: لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (وہ لوگ ضرور بالضرور یہ جواب دیں گے: یہ سب کرنے والا اللہ ہے۔ وہ لوگ اللہ کو مانتے تھے، اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ بیت اللہ کا طواف بھی کرتے تھے، کوئی کام شروع کرنا ہوتا تو باسمک اللّٰھم سے شروع کرتے، کوئی تحریر لکھنی ہوتی، تو اس کے شروع میں باسمک اللّٰھم (اے اللہ! تیرے نام سے شروع کرتا ہوں) حج کرتے اور اس میں لبیک پڑھتے تھے، لبیک اللّٰھم لبیک، لبیک لا شریک لک پھر لا شریک لک کے بعد إلا شریکا ھو لک. [(۱)] البتہ ایک شریک ہے، اتنا اضافہ کر دیا۔ عبادت بھی اسی طرح کرتے تھے۔

اس کے باوجود کہا جا رہا ہے کہ وَ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (میں جس ذات کی عبادت کرتا ہوں، تم اس کی عبادت نہیں کرتے) اور آئندہ بھی تم شرک پر باقی رہتے ہوئے اس کی عبادت نہیں کرو گے۔ تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں اللہ کی عبادت کا انکار کیوں کیا گیا؟ حالاں کہ وہ اللہ کے وجود کو بھی مانتے تھے، اور مذکورہ بالا امور بھی انجام دیتے تھے، <u>بات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ساری کائنات کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بعض یا سارے اختیارات ان دیوی دیوتاؤں کو دے دیے ہیں۔ زمین، آسمان، چاند، سورج، انسان اور جنات ان سب کو پیدا کرنے کے بعد اب اللہ تبارک وتعالیٰ ویسے ہی بیٹھ گئے ہیں۔ اب بقیہ تمام امور یعنی روزی دینا، کسی بیمار کو شفا دینا اور دیگر حاجات پوری کرنا یہ ان دیوی دیوتاؤں کا کام ہے، گویا ان کو وہ لوگ اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے تھے اور حاجت روا اور مشکل کشا مانتے</u>

---

(۱) أخرجه مسلم برقم: ۱۱۸۵.

تھے۔ جیسے ہمارے ہاں غیر مسلم، ہنود سے پوچھا جائے کہ علم کون دیتا ہے؟ تو وہ جواب دیں گے: سرسوتی دیوی (સરસ્વતી દેવી) علمی اداروں میں اس کی تصویر یا مورتی مستقل ٹیبل پر رکھی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک اسی سے علم ملتا ہے۔ اگر پوچھا جائے کہ دولت کون دیتا ہے؟ تو جواب دیں گے کہ لکشمی دیوی (લક્ષ્મી દેવી) مطلب یہ ہے کہ مختلف دیوی اور دیوتاؤں کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہے۔ اسی طرح مکہ کے مشرکین کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ گویا اللہ تعالیٰ کو پیدا کرنے والا ماننے کے بعد دیگر اختیارات ان شرکاء کے حوالے کر دیے ہیں۔ چناں چہ وہ لوگ ان معبودانِ باطلہ کو شریک ٹھہرانے کے ساتھ اللہ کو مان رہے ہیں، اس سلسلہ میں قرآن کہتا ہے کہ یہ اللہ کو ماننا نہیں ہے۔ سیدھی بات!!! وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (میں جس کی عبادت کرتا ہوں، تم اس کی عبادت نہیں کرتے)

اللہ کو ماننا تو اُسی وقت کہا جائے گا جب اللہ کو اس کی تمام صفات کے ساتھ مانا جائے۔ اللہ کی صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ زندگی دینے والا اس کے سوا کوئی نہیں۔ موت دینے والا وہی ہے، اور کوئی نہیں۔ روزی دینے والا وہی ہے، اور کوئی نہیں۔ بیماری اور تندرستی دینے والا وہی ہے، اور کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی تمام صفات میں یکتا ہیں، کوئی ان صفات میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ **اگر تم اللہ کی ان صفات میں کسی کو شریک مانتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اللہ کو نہیں مانتے ہو۔ تمہارا اللہ کو ماننا معتبر نہیں ہے۔** معتبر نہ ہونے کی وجہ سے ہی یہ جملہ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ. استعمال کیا گیا۔ میں جس کی عبادت کرتا ہوں، تم اس کی عبادت نہیں کرتے۔

توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ ہر چیز میں اللہ تنِ تنہا ہے۔ کسی بھی چیز میں کوئی دیوی دیوتا اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ جیسے آسمانوں کا پیدا کرنے والا، زمین کا پیدا

کرنے والا، سورج اور چاند کا پیدا کرنے والا، انسان اور جنات کو پیدا کرنے والا، جانوروں کو پیدا کرنے والا وہی اکیلا ہے۔ اور سب کی حاجتوں کو پورا کرنے والا بھی وہی اکیلا ہے، سب کو روزی دینے والا بھی وہی اکیلا ہے، سب کو تندرستی اور شفا دینے والا بھی وہی اکیلا ہے، سب کا مشکل کشا بھی وہی اکیلا ہے۔ **اگر آپ اللہ کے علاوہ کسی اور کو مشکل کشا یا حاجت روا، مختار کل سمجھتے ہیں تو اس کا مطلب ہوا کہ آپ نے اللہ کا انکار کیا۔ یہ ایک خاص نکتہ ہے، جو اس سورت میں بتلایا گیا ہے۔**

یہ بھی شرک ہے:

اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ ہمارے مسلمانوں میں بھی بعض لوگ اپنی جہالت اور نادانی اور اسلامی تعلیمات سے دوری کی وجہ سے اللہ کے بعض نیک بندوں، اولیاء و انبیاء پیغمبروں کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ ہماری حاجات کو پورا کرنے والے ہیں۔ اور بہت سے لوگ اگر بچہ بیمار ہو، تو کسی بزرگ کے مزار پر جا کر ان سے سوال کرتے ہیں کہ ہمارا بیٹا بیمار ہے، آپ ان کو تندرست کر دیجیے۔ بہت سے بے اولاد، بزرگوں کے مزار پر جا کر سوال کرتے ہیں کہ داتا! ہمیں بیٹا دے دو، بیٹی دے دو۔ اس طرح اپنی حاجات ان سے مانگنا گویا اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنا ہے۔ یہ اللہ کا انکار ہے۔ جس طرح مشرکین مکہ شرک میں مبتلا تھے، اسی طرح یہ لوگ بھی شرک میں مبتلا ہیں۔ **کوئی بڑے سے بڑا رسول اور پیغمبر ہو، اس کا اپنا ایک مقام ہے، اس کا ادب واحترام سر آنکھوں پر!!! لیکن وہ صفات اور وہ کمالات جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں، ان کو اس کے لیے ثابت کرنا کفر و شرک ہے، اور توحید کے خلاف ہے۔**

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تنبیہ:

بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مرض الوفات میں چادر اوڑھے ہوئے تھے، گھٹن ہوتی تو سر سے چادر ہٹا دیتے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ کلمہ تھا: لعن الله اليهود و النصارىٰ اتخذوا قبور أنبيائهم مساجد؛ يحذِر ماصنعوا. **(اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنادیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کو اس فعل سے بچانا چاہتے تھے)**(۱) اس لیے تنبیہ کے طور پر فرمایا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے متعلق یہ فرماتے ہیں تو چہ جائیکہ کسی ولی کی قبر پر سجدہ کیا جائے اور اس سے حاجتیں مانگی جائیں اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔

اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف:

کئی سال پہلے کا قصہ ہے: ایک مرتبہ ہم دو چار ساتھی خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر دہلی، مہرولی گئے- جو ہمارے سلسلہ کے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بڑے خلیفہ ہیں- وہاں دیکھا کہ ایک آدمی سجدہ میں گرا ہوا ہے۔ اس کو روکا کہ بھائی! یہ پیشانی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے سامنے جھکنے کے لیے بنائی ہے، لیکن وہ حجت کرنے لگا۔ **بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ہم کو تو جو کچھ بھی ملا ہے اسی دروازے سے ملا ہے، یہ اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ ہر مؤمن کو چاہیے کہ ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو باز رکھے۔**

---

(۱) أخرجه البخاري برقم: ۱۳۳۰.

مگر مؤمنوں پر کشادہ ہیں راہیں:

اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت بھی اسی انداز سے کرنی چاہیے، ایک کافر اپنے دیوی دیوتا کے سامنے سجدہ کرتا ہے، اس کو تو ہم کہتے ہیں کہ وہ کافر ہو گیا۔ اور ہمارا کوئی آدمی بزرگوں کی قبروں کے سامنے سجدہ کرے، تو اس کا ایمان سلامت رہتا ہے!!! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ خواجہ الطاف حسین حالیؒ نے مسدس میں اسی مضمون کو بہت اچھے انداز سے پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر	جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہرِ سجدہ تو کافر (۱)	کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مؤمنوں پر کشادہ ہیں راہیں	پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں	اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں	شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے	نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

حقیقت تو یہ ہے کہ جو معاملہ مشرکین اپنے دیوتاؤں اور بتوں کے ساتھ کرتے تھے آج کا مسلمان اپنی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے بزرگوں کے مزارات پر وہی معاملہ کرتا ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

چوکنا رہیے!!!

دوسری بات یہ ہے کہ آج ہم اس ملک میں، جس ماحول میں رہتے ہیں، اور اس

---

(۱) بعض نسخوں میں یہ کلمات ہیں ؎ کہے آگ کو قبلہ اپنا تو کافر

وقت اس ملک پر جو لوگ برسرِ اقتدار ہیں، وہ سب کفر اور شرک میں مبتلا ہیں۔اور اب رفتہ رفتہ وہ یہاں کے تعلیمی نظام کو مشرکانہ بنانا چاہتے ہیں، اور اسی لیے اسکولوں میں با قاعدہ سرسوتی دیوی(સરસ્વતી દેવી) کی مورتی رکھی جاتی ہے، اور آنے والے ہر بچہ کو اس بات کا پابند کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے، جس کو سرسوتی وندنا(સરસ્વતી વંદના) کہتے ہیں۔ یوگا بھی ان کے ہاں عبادت ہی کی ایک قسم ہے۔ چناں چہ یہ لوگ ان مختلف شکلوں کو اس وقت بتدریج غیر مسلم اسکولوں میں، عصری تعلیم گاہوں میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ ہمارا ملک سیکولر ہے، مذہبی نہیں ہے۔ تو یہ تعلیم گاہیں مذہبی خیالات سے دور اور پاک ہونی چاہیے، اِن میں ان چیزوں کی طرف میلان نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن یہ سب کیا جا رہا ہے۔ ایسے موقع پر ہم سب مسلمانوں کو بہت زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، کہیں نصاب میں ایسی چیزیں جن سے ہمارے بچوں کے عقیدے خراب ہوتے ہوں، یا اسکول میں بچوں سے ایسے اعمال کروائے جائیں، جن سے -نعوذ باللہ- ایمان سے محرومی کا اندیشہ ہو، تو ان سے چوکنارہ کر ہمیں اس کو ختم کرنے، دور کرنے کی اجتماعی طور پر سعی کرنی چاہیے۔

شرکیہ عمل کے لیے ہم تیار نہیں، مفکر اسلام :

آج سے کئی سال پہلے یوپی کی حکومت نے راجیو گاندھی کے دور حکومت میں با قاعدہ سرکلر جاری کیا تھا کہ تمام اسکولوں میں آنے والے بچے اسکول میں آتے ہوئے پہلے سرسوتی وندنا(સરસ્વતી વંદના) کریں گے، یعنی سرسوتی دیوی کو ہاتھ جوڑیں گے۔ تو اس زمانہ میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہٗ نے راجیو گاندھی کے پاس جا کر پوری قوت سے بات کی کہ ہم اپنی اولاد کو اسکولوں میں بھیجنا بند کر دیں گے۔ یہ تو

کھلا شرک ہے، ہم اپنی اولاد کے لیے اس کو برداشت نہیں کریں گے۔ ہم اس ملک میں اپنی پوری توحید اور اپنے تمام ایمانی اعمال کے ساتھ رہیں گے، ہم کسی بھی شرکیہ عمل کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ اُسی زمانہ میں حضرت نے اپنے بیانات میں یہ مضمون جگہ جگہ بیان فرمایا:

اَمۡ كُنۡتُمۡ شُهَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ يَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ ۙ اِذۡ قَالَ لِبَنِيۡهِ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِىۡ. (البقرۃ ۱۳۳:) حضرت یعقوب علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹوں کو جمع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے دنیا سے جانے کے بعد تم کس کی عبادت کروگے؟ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا. (البقرۃ:۱۳۳) (جواب میں ان بچوں نے عرض کیا کہ ہم آپ کے معبود کی اور آپ کے باپ دادوں حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق کے معبود اسی ایک اللہ کی عبادت کریں گے۔ وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ (البقرۃ:۱۳۳) (ہم اسی کے سامنے سر جھکائیں گے) تو ہمیں اس ملک میں ایسی چیزوں سے بہت زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ اور اب تو باقاعدہ انہوں نے ان کی ایک نئی تعلیمی پالسی (Policy) وضع کی ہے اور وہ بالکل کفریہ اور شرکیہ ہے۔ ایسے موقع پر تمام مسلمانوں کو متحد ہوکر اپنے ایمان کی حفاظت کی کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرا سبق، شریعت کے حکم بدلے نہیں جاسکتے:

دوسرا سبق اس میں یہ ہے کہ ان لوگوں کے صلح کی پیشکش کرنے پر جواب میں کہا گیا تھا کہ تم اپنے کفر پر رہتے ہوئے اور ہم اپنے ایمان پر رہتے ہوئے مذہب کے معاملہ میں، آپس میں متحد نہیں ہوسکتے۔ ایسی ایکتا اور ایسے اتحاد کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ **ایسی صلح جس کے نتیجہ میں ہمیں اپنے مذہبی اصول کو قربان کرنا پڑے، اپنے ایمان سے ہاتھ دھونا**

پڑے شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ اور ویسے بھی حضور ﷺ نے صلح کے سلسلہ میں ایک اصول بتلا دیا ہے کہ الصلح جائزبين المسلمين إلا صلحاً حرم حلالاً أو أحل حراماً. (مسلمانوں کے درمیان ہر صلح جائز ہے، مگر وہ صلح جو شریعت کی حلال کردہ کسی چیز کو حرام قرار دیتی ہو، یا شریعت کی حرام کردہ کسی چیز کو حلال قرار دیتی ہو؛ وہ جائز نہیں ہے)[۱] گویا شریعت کے حکم بدلے نہیں جاسکتے۔

لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق:

سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں وضاحت سے گزر چکا کہ لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق.[۲] اللہ تعالیٰ نے بہت سے لوگوں کی اطاعت کا حکم دیا ہے، اولاد کو ماں باپ کی اطاعت کا، بیوی کو شوہر کی اطاعت کا؛ لیکن ان کے سلسلہ میں بھی تاکید ہے کہ ماں باپ اگر کوئی ایسا حکم دیتے ہیں جس کی وجہ سے شرک لازم آتا ہو تو قرآن نے کہا: وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا. (لقمان:۱۵) ان کی بات مت ماننا؛ البتہ ماں باپ ہیں، دنیوی زندگی میں ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنا؛ لیکن ان کی بات پر عمل کرتے ہوئے شرک اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔ کسی حال میں بھی ایسی کوئی شکل جس سے -نعوذ باللہ- شرک لازم آتا ہو، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی، یا شریعت نے جس کو حرام قرار دیا ہو ایسا کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ کوئی بھی صلح ایسی ہو

---

(۱) أخرجه أبو داود برقم: ۳۵۹۴ والترمذي: ۱۳۹۲ وابن ماجة: ۲۳۵۳.

(۲) أخرجه الطبراني بهذا اللفظ في الأوسط برقم: ۳۹۱۷ (ط: دار الحرمين، القاهرة) وأخرجه أحمد في مسنده برقم: ۲۰۲۵۳ و ۲۰۲۵۲ ولفظه: "لا طاعة فی معصية الله".

جو شریعت کے کسی صریح حکم کو بدلنے والی ہو اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی ہے۔ ہمارے بڑوں نے اس معاملہ میں - ماشاءاللہ - بہت ہمت سے کام لیا ہے۔

کاش میری سو جانیں ہوتیں

ایک دل سوز واقعہ:

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ کی ماتحتی میں ایک لشکر بھیجا گیا تھا، رومیوں نے اس لشکری دستہ کو قید کر لیا، اور قید میں رومی بادشاہ نے حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ کو پہلے تو لالچ دلایا کہ اگر تم مذہبِ اسلام چھوڑ دو، تو میں اپنی بیٹی کا نکاح تم سے کرا دوں، اور اپنی آدھی سلطنت تم کو دے دوں۔ لیکن یہ تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے کہا: آدھی کیا؟ تیری پوری سلطنت کیا؟ پوری دنیا کی سلطنت بھی دے، تب بھی میں اسلام اور ایمان چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس نے دیکھا کہ لالچ کام نہیں کرتا، تو دھمکی دی کہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ اور باقاعدہ عملی طور پر ایک دیگ آگ پر چڑھائی، اس میں تیل ڈالا، جب تیل خوب کھولنے لگا، تو قیدیوں میں سے ایک قیدی کو ان کے دیکھتے ہوئے اس میں ڈالا، اندر پڑتے ہی اس کے سب اعضاء الگ ہو گئے، اور وہ جل گیا۔ کہا کہ دیکھو! تمہارے ساتھ بھی یہ معاملہ ہوگا۔ انہوں نے کہا: تم جو چاہو، کرو۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کو پکڑو، اور اندر ڈالو۔ جب ان کو ڈالنے کے لیے پکڑا تو ان کی آنکھوں سے آنسو نکلے، بادشاہ سمجھا کہ شاید نرم پڑ گئے ہیں، تو اس نے بلا کر پوچھا: کیا بات ہے؟ آنکھوں میں آنسو آ گئے!!! کچھ ارادہ بدلا ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں! **آنکھوں میں آنسو تو اس لیے آئے ہیں کہ مجھے افسوس ہے کہ آج اللہ کے راستے میں قربان کرنے کے لیے میرے پاس ایک ہی**

جان ہے۔ اگر میرے ہر بال کے برابر میرے پاس جانیں ہوتیں، تو میں ان ساری جانوں کو اللہ کے راستے میں قربان کر دیتا۔ بادشاہ سمجھ گیا کہ یہ اپنی بات سے نہیں ہٹیں گے۔ تو کہا: اچھا! ایک کام کرو، میری پیشانی کو بوسہ دو تو چھوڑ دوں۔ انہوں نے کہا: مجھ اکیلے کو چھوڑو گے یا میرے ساتھیوں کو بھی؟ اس نے کہا کہ ساتھیوں کو بھی۔ تو حضرت عبداللہ بن حذافہؓ نے کہا: ٹھیک ہے۔ کافر بادشاہ کی پیشانی کو بوسہ دینا اس قدر ناجائز نہیں، بلکہ اس کا ایک درجہ ہے۔ تمام احکام کی شریعت میں کیٹیگری رکھی گئی ہے، تو انہوں نے سوچا کہ اس سے سب ساتھیوں کی جان بچ جاتی ہے، اس لیے مان لیا۔ دیکھو! جان کی دھمکی دی گئی تھی، تب بھی وہ نہیں مانے، لیکن ساتھیوں کی جان بچانے کے لیے تسلیم کیا۔ بوسہ دیا، اور خود کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی جان بچا کر لے آئے۔ مدینہ منورہ واقعہ کی خبر پہنچ چکی تھی۔ حضرت عمرؓ کا دور خلافت تھا، حضرت عمرؓ نے اعلان کیا، سب کو حکم دیا کہ مدینہ سے باہر جا کر ان کا ستقبال کریں، اور ان کی پیشانی کو سب بوسہ دیں، اور سب سے پہلے میں بوسہ دوں گا۔ (۱)

اس کی اجازت ہے:

بہر حال! یہ دوسرا سبق ہے کہ ایمان کے معاملہ میں کسی کے ساتھ صلح نہیں کی جا سکتی، ایسی صلح کی شریعت اجازت نہیں دیتی، جس میں ہمیں اپنے مذہب کے اصولوں کو چھوڑنا پڑے، اس کے باب میں ہمیں رعایت کرنی پڑے۔ ہاں! اس کو چھوڑے بغیر اگر کوئی صلح

(۱) معرفة الصحابة لأبي نعيم الأصبهاني: ۳/ ۱۶۱۵ [۴۰۶۷] (ط: دار الوطن، الرياض) وشعب الإيمان للبيهقي: ۳/ ۱۷۹ [۱۵۲۲] (ط: مكتبة الرشد، الرياض) والاستيعاب في معرفة الأصحاب لابن عبدالبر: ۳/ ۸۹۰ [۱۵۰۸] (ط: دار الجيل، بيروت) وتاريخ دمشق لابن عساكر: ۲۷/ ۳۵۷-۳۶۰ [۳۲۳۷] (ط: دار الفكر للطباعة والنشر)

کی جاسکتی ہے تو اس کی گنجائش ہے۔ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا. (الانفال:٦١) (اگر غیر مسلم صلح کے لیے مائل ہوتے ہیں تو اے نبی! آپ بھی مائل ہوجائیں) تو ایسی صلح جس میں دین کے اصولوں کو قربان نہ کرنا پڑتا ہو تو اس کی اجازت ہے۔ جیسے ہم مل جل کر ایک مشترکہ دشمن کا مقابلہ کریں گے، مل جل کر اپنے ملک کو ترقی دینے کے لیے تجارت وغیرہ میں ساتھ رہ کر کام کریں گے، تو اس کی اجازت ہے۔ شریعت اس سے منع نہیں کرتی۔

یہ دو سبق اس سورت سے ہمیں دیے گئے ہیں، ان کا ہمیں خاص اہتمام ہونا چاہیے۔

ادارے کی دیگر مطبوعات

نمبر شمار	اسماءِ کتب
۱	جدید معاملات کے شرعی احکام
۲	بہارِ نبوت (اول) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب جونپوریؒ نمبر (انٹرنیٹ پر دستیاب ہے)
۳	بہارِ نبوت (ثانی) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب جونپوریؒ نمبر
۴	برما اور عالمی حالات اپنا طرزِ زندگی درست کیجیے (اردو، گجراتی)
۵	آیئے! نماز صحیح کریں (گجراتی، اردو)
٦	علمی و عرفانی شہ پارے
۷	چراغِ سہارنپور
۸	دعا ایسے مانگیں (گجراتی، اردو)
۹	آسان درس قرآن (سورۂ فاتحہ)
۱۰	آسان درس قرآن (معوذتین تا سورۂ کافرون)
۱۱	بیعت ہونے والوں کو ہدایات
۱۲	القول المبين في ذكر المجاز والمجيزين

DARUL HAMD RESEARCH INSTITUTE

SODAGARWADA, SURAT,GUJARAT (INDIA)

+91 9173103824